صدائے رفعت

از

مولانا ابوالکلام آزاد

پیش لفظ

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے اگر سیاسی اختلافات کا پہلو جدا کر دیا جائے تو باقی جو کچھ رہ جاتا ہے۔ اسے علم و ادب کا مرقع کہنا بیجا معلوم نہیں ہوتا۔ علم و ادب کا ایک ایسا مرقع جو دُنیا بھر کی تہذیبوں اور ثقافتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔

مولانا آزاد کے متعلق یہ کسی کا بجا ارشاد ہے کہ :-

جب وہ گفتگو فرماتے ہیں۔ تو علم و ادب کے راز ہائے سربستہ حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مسائل کی موشگافیاں ہوتی ہیں۔ باریک ترین نکتے اس طرح کھلتے ہیں۔ جیسے عقل خود انہیں ناخن تدبیر سے سلجھا رہی ہے۔ اور جب وہ قلم اٹھاتے ہیں تو علم ادب کے دامن پہ الفاظ معانی کی ایسی گلکاریاں ہوتی ہیں۔ جو۔

آنکھ کے لئے وجہ بصیرت
دماغ کے لئے افزائش علم
ذہن کے لئے مشعل راہ ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ مولانا آزاد کے ادب نے ہر مکتب خیال کے انسان کو خراج تحسین پیش کرنے پہ مجبور کیا ہوا ہے اور آج

قیمت ...... تین روپے

جید پریس دہلی

آزاد اکیڈیمی۔ دہلی۔

ملنے کا پتہ

نازپبلشنگ ہاوس

البدہ فاطمہ بنت عبداللہ

الصبر یحمد فی المواطن کلہا

الّاعلیک فانھا سزموم

چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو صفحوں پر بچھانا چاہتا ہوں، کیونکر بچھاؤں؟ چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں، کیونکر پھیلاؤں؟ آہ ان لفظوں کو کہاں سے لاؤں۔ جو دلوں میں ناسور پیدا کر دیں؟ آہ اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں: پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے۔ مگر جب دل پتھر کے بن جاتے ہیں، ان کا گھلانا محال ہے۔ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ٥ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۵ اور کائنات انسانیت میں جتنی زندگی ہے دل کے ناسوروں اور جگر کے زخموں ہی کی وجہ سے ہے جب تک دل زخمی ہیں۔ تندرست ہے۔ لیکن جس دن دلوں کے زخم بھر گئے اُس دن یقین کیجئے کہ آپ زندگی سے خالی بھی ہو گئے۔

آج کے نمبر کے ساتھ ایک خاص صفحہ تصویر کا شائع کیا جاتا ہے۔ مگر آنکھوں کا طالب نہیں ہوں۔ جو اس کو دیکھیں، دل کا طالب ہوں جو اس کو پڑھیں، پھر کوئی ہے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو؟

معمورۂ دلے اگرت ہست باز کوئے نکیں جا سخن بہ ملکِ فریدوں نمے رود

باوجود ہزار سیاسی اختلافات بلکہ بدترین تضادِ فکر کے مملکت پاکستان میں صاحبانِ بصیرت کے نزدیک مولانا آزاد کے ادبی شہ پاروں کو ایک مقام حاصل ہے۔ ایک ایسا مقام جو قابلِ عزت بھی ہے۔ اور قابلِ تحریم بھی۔

مولانا آزاد کے علمی کمال کا یہ نقطۂ عروج ہے۔ کہ انہوں نے اگر دُنیا کی تہذیب اور تمدّن پر علم و ادب کی روشنی ڈالی۔ تو پتھر کے زمانہ کے قبل از تاریخ واقعات یوں نمایاں ہوگئے۔ جیسے ان کی نمود ابھی دوش کے دامن میں جھلک رہی ہو۔

انہوں نے اگر اسلامی نظریات کی تشریحات کیں۔ تو یوں محسوس ہوا۔ جیسے قرونِ اولےٰ ماضی کی تاریکیوں سے نکل کر حال کے خد و خال پر اپنا عکس ڈال رہا ہے۔

یہ مجھے مولانا آزاد کا علم و ادب جس کی افادی اہمیت کے پیشِ نظر اس مختصر کتاب کی ترتیب دی گئی ہے۔ اور ان ادبی کاوشوں کو کتابی صورت میں کر دیا گیا ہے۔ جو مولانا کی علمی اور ادبی کاوشوں میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ کتاب کی طباعت کتابت اور کاغذ کی ناموزونیت بہرحال میرا ذاتی قصور ہے۔ جس کی وجہ ناچاری ہے اور حالات کی ناسا عدت۔

مرزا جانباز

مشہور قبیلہ (قبیلۂ البراعصنہ) تھا۔ جو کثرتِ نفوس اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے اندرون طرابلس کا سب سے بڑا قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔

اس قبیلے کا سردار شیخ عبداللہ تھا، جس کو عرب اپنی بول چال کے قاعدہ تخفیف سے عبدہ پکارا کرتے ہیں۔ اس مجاہد غیور نے آغاز جنگ سے خالصاً لوجہ اللہ جو عظیم الشان خدماتِ جہاد انجام دیں۔ ان کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ جنگ کے تمام ترک افسر اس بارے میں متفق اللسان ہیں۔ کہ اگر شیخ عبداللہ کے جاں فروشانہ عزائم اول کار میں ساتھ نہ دیتے۔ تو بعد کی کامیابیاں ہرگز حاصل نہ ہو سکتیں۔ مختصر یہ ہے کہ اس فدائے اسلام نے اپنے قبیلے کو اُبھارا۔ اطراف و نواح کے دوسرے قبائل کو آمادۂ جہاد کیا۔ اپنا تمام مال و متاع ترک افسروں کے سپرد کر دیا، تمام عربوں کو بطور نفقۂ جنگ کے روزینہ دیا جاتا تھا، اس کے لینے سے بھی اُس نے انکار کر دیا۔ پھر اپنے خاندان کے تمام مردوں اور عورتوں کو لا کر دشمنانِ اسلام کے آلاتِ جہنمی کے سامنے لا کر کھڑا کیا۔ اُن کو کٹوایا اور آخر میں خود بھی ان کی رفاقت میں روانہ ہو گیا۔ خدا نے اپنی محبت کی پہلی شرط یہ قرار دی کہ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس کی راہ میں ان چیزوں کو نہ لٹا دو۔ جو تم کو محبوب و مطلوب ہیں۔ کیونکہ ایک دل میں محبت کے دو آشیانے نہیں بن سکتے انسان کی دنیوی محبوبات میں مال و متاع، اہل و عیال، پھر نفس و جان یہی تین چیزیں وہ سب سے زیادہ بوجھل زنجیریں ہیں۔ جو اس

غزوۂ طرابلس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ صدیوں کے بعد اُس نے صدرِ اوّلِ اسلام کے غزوات و مجاہدات کے واقعات زندہ کر دیئے۔ اور مدتوں کے بعد عرب بادیہ کو موقعہ ملا کہ ان کے اصلی جوہر نمایاں ہوں۔ بدر اور اُحد کے واقعات میں ہم پڑھتے تھے کہ ایسی عورتیں تھیں۔ جو اپنے اٹھ اٹھ لڑکوں کو اللہ کی راہ میں زخمی کر کے پھر خود زخمی ہو جاتی تھیں۔ اور اللہ کے رسُول محبُوب کی محبت میں ایسی محو تھیں کہ تیروں پر تیر کھاتی تھیں۔ مگر اپنے جسم کو ان کے سامنے ڈھال کی طرح رکھتی تھیں۔ یہ ہم پڑھتے تھے۔ مگر خدا کی طرابلس نے یہ تمام واقعات دہرا دیئے۔

اس جنگ کی پہلی خصوصیت عورتوں کی شرکت ہے۔ غزوۂ طرابلس کے لئے جب اطراف و جوانب اور اندرون شہر سے قبائل جمع ہونے لگے۔ تو ہر قبیلے کے ہمراہ اس کا پورا خاندان تھا۔ ان میں ہر طرح کی عورتیں ہوتی تھیں۔ وہ نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں جن کے ابھی کھیل کود کے دن تھے۔ بڑھیا عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ جن کے جسم قوتِ جواب دے چکے تھے۔ بہت سی عورتیں ایسی بھی ہوتی تھیں کہ ان کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اور وہ ان کو الگ نہیں کر سکتی تھیں۔ ہم نے وہ تصویریں دیکھی ہیں۔ جن میں کسی عورت نے ایک طرف تو گود میں بچہ اُٹھا لیا ہے۔ اور دوسری جانب پانی کی مشک ہے۔ اور میدان جہاد کے زخمیوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔

جن قبائل نے سب سے زیادہ جنگ میں حصہ لیا۔ ان میں ایک

جن کی وجہ سے وہ ہزار ہا مردوں اور عورتوں میں بھی پہچان لی جاتی تھی، اوّل تو اس کی عمر بہت چھوٹی تھی، زیادہ سے زیادہ گیارہ برس کی ہوگی۔ دُوسرے اس کو جنگ اور جنگ کے زخمیوں سے کچھ ایسا اُنس ہو گیا تھا کہ سخت سے سخت معرکوں میں بھی اس مسابقت اور پیش قدمی کو ہر سپاہی محسوس کرتا تھا، جنگ خواہ حملے کی ہو۔ یا تلواروں اور سنگینوں کی سامنے صفیں ہوں، مگر زخمی مسلمان کی آہ میں اس کے لئے ایک ایسی کشش تھی جس کو سُن لینے کے بعد محال ہو جاتا تھا، کہ اس کی چھوٹی سی مشک اپنے فرض کو بھول جائے۔ وہ کم سن تھی۔ لیکن اس کے اندر ایک کہن سال عشق موجود تھا۔ یہ عشق لہو ولعب یا تمتعاتِ حیات کا نہ تھا۔ بلکہ خون زخم اور کٹی ہوئی انسانی رگوں کا، جہاں کہیں یہ چیزیں موجود ہوتیں وہ ایک باد رفتار ہرنی کی مستعدی مگر فرشتۂ عشق کے پروں سے اُڑتی ہوئی وہاں پہنچ جاتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ بارود کے دُھوئیں سے تمام فضا تاریک ہو رہی ہے، کانوں کے پردے توپوں کی سامعہ شکن صداؤں سے پھٹ رہے ہیں۔ گولوں کے پھٹنے سے ایک عارضی روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انسانی احتضار کی چیخیں پچھلی مہیب گرجوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب وحشت انگیز سماں برپا کر دیتی ہیں۔ ایسے جگر خراش اور زہرہ گداز عالم میں وہ معصوم ہرنی (مجھے اچھی طرح یاد ہے) اپنا اونچا کرتہ پہنے ہوئے اور پھٹی ہوئی خمار کمر کے گرد لپیٹے ہوئے اس طرح دوڑ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ مظلوم و محتاج زخمیوں کی خبر گیری کے لئے کوئی فرشتۂ ربانی آسمان سے اُتر آیا ہے۔ اور

راہ میں پاؤں کو ہلنے نہیں دیتیں، اس فانی فی اللہ عاشق صادق نے ایک ہی وقت میں ان تینوں منزلوں کو طے کر لیا، سب سے پہلے مال ومتاع کو اس کی راہ میں لٹایا، پھر اپنے عزیزوں کو قربان کیا، آخر میں جان رہ گئی تھی، یہ بھی جان آفریں کے سپرد کر دی۔ لا یؤمن احدکم حتی احب الیہ من والدہ و الناس اجمعین۔

آنکس کہ ترا بخواست جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِي نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲ : ۲۰۷) اور اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں۔ جو اس کی رضا جوئی کی راہ میں اپنی جان تک دے دیتے ہیں۔ اور اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت رکھتا ہے۔

اس کا تمام خاندان مصروف پیکار و خدمات جہاد تھا۔ لیکن اولاد میں صرف ایک گیارہ برس کی لڑکی فاطمہ تھی۔ جس کی محویت و استغراق کو دیکھ کر تمام ترک افسر اور سپاہی حیران رہ جاتے تھے۔ ڈاکٹر اسمٰعیل شاقی بک جنہوں نے اس کی تصویر اتاری تھی لکھتے ہیں۔

"سب سے پہلے میں نے اس معصوم انسان کو اس وقت دیکھا جب میں پہلی مرتبہ اپنی جماعت لے کر عزیزیہ سے زوارہ آیا تھا، عورتوں اور لڑکیوں کی لشکر میں کمی نہ تھی۔ کیونکہ ہر عرب مع اپنے پورے خاندان کے شریک جہاد ہوا تھا، لیکن چند مخصوص باتیں فاطمہ میں ایسی نظر آتی تھیں

بتلائی تھی، مگر دراصل بارہ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ عربوں اور ترکوں کی متحدہ فوج کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین ہزار تھی۔

یہ لڑائی دن بھر جاری رہی اور عصر کے وقت بارہ سو لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر اپنی عادتِ مستمرہ جنگ کے مطابق اطالیوں نے ساحل کا رُخ کیا۔

عین دوپہر کا وقت تھا۔ اٹالین توپ خانہ دونوں جانب سے آگ برسا رہا تھا، دس ہزار بندوقوں کے چھوٹنے کی آواز ایک ہی وقت میں کڑک رہی تھی، تمام ریگستان میں موت اور ہلاکت کے سوا کچھ نہ تھا اس وقت اس بہشت زار شہادت کی حُور عین فاطمہ کہاں ہے؟

وہ بدستور اپنے ہی کام میں مشغول ہے۔ اس کی دائمی رفیق مشک اس کی پیٹھ پر ہے، دھوئیں اور تپش کی شدّت سے چہرہ جُھلسا ہوا ہے۔ بالوں پر سُرخی مائل ریت کی تہ جمی ہوئی ہے۔ کپڑے اس کے محبُوب "سُرخ رنگ" کے دھبّوں سے رنگین ہو رہے ہیں۔ اور اپنی مخصوص مجنونانہ محویت کے پردوں سے فضائے جنگ میں اُڑ رہی ہے۔

اس کی ماں بھی اسی خدمات میں شریک ہے، مگر اس کا ساتھ کون دے سکتا ہے؟ اس کا باپ بھی اپنے قبیلے کے ساتھ معروفِ جاں بازی ہے۔ عصر کا وقت جب قریب آ گیا تو مجاہدین آخری عزم فیصلہ کن کے ساتھ دشمنوں پر ٹوٹ پڑے، اور ان کی صفوں میں گھس کر تلواروں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ احمد نوری بیک تُرکی کمان افسر نے عربوں کے ہجوم کو دیکھا تو خود بھی اپنی جماعت

اللہ نے ہوا اور زمین کو اُس کے تابع کر دیا ہے۔ کہ وُہ اُٹھلتے رہے اور بہ لپٹتی جائے، سامنے سے گولوں کی لگاتار بارش ہو رہی تھی، مگر یہ اسی بارش پر تیرتی ہوئی جاتی تھی، انسانی لاشیں ایک پر ایک گر رہی تھیں، مگر ہر نئی لاش گرنے کی آواز خوف کی جگہ اُس کے دل میں قوت کی نئی رو پیدا کر دیتی تھی، یہ حالت دیکھ کر میں بے اختیار ہو گیا۔ کچھ بعید نہیں کہ ایسے خطرناک اور یکسر موت و ہلاکت کے عالم میں یہ برق وش ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھُپ جائے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کی مرتبہ اگر وہ نمودار ہوئی تو کسی نہ کسی طرح پکڑ کر سمجھاؤں گا، کہ موت کی اس درجہ آرزومند کیوں ہو گئی ہے ؟

تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک چھوٹا سا سایہ قریب سے گذرا، میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا تجھے نہیں معلوم کہ تو لپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہے ؟

چھوڑ دو کیا تم بھول گئے کہ اسلام اور وطن کے کتنے فرزند یہاں پیاسے دم توڑ رہے ہیں ؟ یہ کہا اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ مجھ کو سُرخ رنگ سے عشق ہے۔ آہ! یہی رنگ ایک دن میں نے اُس کی گردن اور دل کے نیچے سے بہتا ہوا دیکھا ”۔

۱۲ ار رجب ۱۳۳۱ھ کو زوارہ میں اطالیوں نے دو ماہ کی مسلسل تیاریوں کے بعد ایک بہت بڑا حملہ کیا تھا، عربوں نے بھی جو عرصے کی بیکاری سے گھبرا اُٹھے تھے، بھوکے شیروں، کی طرح اُن کا استقبال کیا، روما سے جو خبر بعد کو مشتہر کی گئی تھی اس میں اطالیوں کی تعداد چھ ہزار

میدان جنگ سے آگے بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ چار ترک زمین پر پڑے ہیں، پاس ہی فاطمہ کی لاش ہے۔ مگر اس حالت میں کہ مشک کا حلقہ ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے۔ اور مشک ایک بیہوش ترک کے سینے پر پڑی ہے۔ شاید مرتے دم بھی زخمی ترک کو پانی پلانے کی کوشش کی تھی، مگر مشک اس کے منہ تک نہ لے جا سکی۔

٭

لے کر دشمنوں کے مشرقی توپ خانے تک بڑھتا ہوا چلا گیا، توپ خانے کے پاس اطالیوں کی ایک تازہ دم جماعت موجود تھی، جس نے اب تک لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، ایک چھوٹی سی جماعت دیکھ کر وہ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور تین ترک سپاہیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر بندوقوں کا نشانہ بنانا چاہا، نہیں معلوم کون سا محافظ ہاتھ تھا جس نے عربی صفوں سے اس قدر دُور فاطمہ کو پہنچا دیا تھا، اُس نے دیکھا کہ جانباز ترک تلواروں کے بے امان ہاتھ مار کر صاف نکل آئے ہیں، نامراد اطالی حریفوں کو روک تو نہ سکے، مگر اب زخمیوں کے سر و سینہ میں سنگین چبھو کر اپنا غصّہ نکال رہے ہیں۔
گیارہ برس کی فاطمہ دیکھتے ہی لپکی اور بغیر ان لوگوں پر نظر ڈالے ہوئے جو پاس ہی کھڑے تھے، اپنی مشک ایک زخمی کے مُنہ سے لگا دی، پر ایک گھونٹ بھی ابھی زخمی کے حلق سے نہیں اُترا تھا کہ دو اطالیوں نے بڑھ کر گردن کے پاس سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ فاطمہ سہم کر تڑپی۔ مگر دشمن کی گرفت مضبوط تھی، فوراً اُس نے زخمی ترک کی پڑی ہوئی خون آلود تلوار اُٹھالی اور اس زور سے ماری کہ اطالوی سپاہی کے داہنے ہاتھ کا پہنچا زخمی ہو کر لٹک گیا، اُس نے گردن چھوڑ دی۔ تاکہ بائیں ہاتھ سے دشمن پر حملہ کر سکے۔

اِدھر بندوق کے چھوٹنے کی آواز آئی اور اُدھر اطالین فوج شکست کھا کر بھاگتی ہوئی نظر آئی۔

عرب اور ترک سپاہی جب دشمنوں کا تعاقب کرتے ہوئے

سلام کی، اصلی سرزمین اِن لاحاصل اور قوائے عملیہ کو بیکار کرنے والی کاوشوں سے بالکل پاک تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اُن سوالات سے صحابہ کو روکا جو ان کی عملی زندگی اور اُن کے نصب العین سے ان کو ہٹانے والے تھے۔ اسلام نے عمل وسعادت کی ایک ہی سیدھی راہ کھول دی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا کہ مسلمان صرف اسی کی رہروی میں مشغول رہیں، آپ کے بعد تمام عہد صحابہ بھی اسی حال میں بسر ہوا۔ لیکن بنو اُمیہ کی حکومت نے نظام خلافت اسلامی میں ایک انقلاب عظیم کر کے اس کی اجتماعی قوت کی نشو ونما روک دی، اور نئے نئے فتنوں اور ہلاکتوں کا دروازہ کھول دیا۔ ایک بڑا فتنہ علوم عقلیہ قدیمہ اور مذہب کا غیر صالح اختلاط تھا، ایک طرف تو مسلم عجمی اقوام اپنی تمام پُرانی بحثوں اور کاوشوں کو اپنے ساتھ لائیں۔ دوسری طرف اہل کتاب اور مجوسی علماء حکومت اموی کی تمام شاخوں اور محکموں پر حاوی ہو گئے، ان لوگوں نے جہاں اپنی مذہبی روایتیں مسلمانوں میں پھیلائیں، وہاں فلسفیانہ مباحث قدیمہ کا وہ دفتر پارینہ بھی کھول دیا، جو اسکندریہ وسوریا کے کھنڈروں اور جندیسا پور و مدائن کے اطلال و آثار کے اندر مدفون ہو چکے تھے۔

دراصل اس سوال کو پیدا کرنا ہی ایک سخت ضلالت اور مسلک شریعت سے انحراف تھا۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ جس کو خدا کے رسول نے ہم تک پہنچایا۔ ہماری معلومات اس کی نسبت صرف اسی قدر ہے۔

تاریخ عہد عباسیہ کا ایک ورق

مسئلہ خلق قرآن اور مناظرہ دربار مامون الرشید

علمائے سلف کی حریت حقہ اور دعوت الی الحق کا ایک نظارہ!

اسلام کے ابتدائی عہدوں میں جن مسائل نے سب سے پہلے اختلاف و تفریق کی بنیادیں رکھی ہیں۔ اور مسلمانوں کو کتاب و سنت کی صراطِ مستقیم اور صحابہؓ کرام کے اسوہ حسنہ سے انحراف کی راہ دکھائی ہے۔ ان میں سے ایک معرکتہ الآرا اور شدید الاختلاف مسئلہ "خلق و قدم قرآن" کا بھی ہے۔

مسئلہ خلق قرآن

مسئلہ "خلق قرآن" مقصود یہ تھا کہ اللہ کا کلام جو ہمارے پاس ایک کتاب کی شکل میں موجود ہے۔ اس میں الفاظ ہیں اور معانی ہیں، الفاظ کی آواز ہے، جو مختلف حرکات زبان و اطراف زبان سے بنتی اور نکلتی ہے۔ معانی کے حقائق منصورہ ہیں جن کا وجود معقولی بھی ہے، اور وجود خارجی بھی، پس ان اعتبارات سے قرآن قدیم ہے یا حادث؟ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟

اس مسئلہ کو فلسفہ دان اقوام کے اختلاط نے پیدا کیا تھا

اور یہ الفاظ جب ہماری زبان سے نکلتے ہیں۔ تو ہماری آواز ہوتے ہیں، جو اس سے پہلے نہ تھی، اور جس کا حدوث ہمارے ہی حلق و زبان سے ہوا۔ پس ان اعتبارات سے قرآن مخلوق ہے قدیم نہیں ہو سکتا علاوہ بریں اللہ ہر شئے کا خالق ہے۔ قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے، اسے بھی مخلوق ہونا چاہیئے۔

ان خیالات سے معتزلہ نے سخت ٹھوکر کھائی۔ انہوں نے دعویٰ کر دیا، کہ قرآن مخلوق ہے اور اس طرح گمراہی و فساد کا ایک بڑا دروازہ اُمت پر کھول دیا۔ ان کی ہدایت فلسفیانہ کاوشوں کے اندر گم ہو گئی وہ یہ نہ سمجھے کہ اصوات حروف کا مخلوق ہونا جو انسان کا فعل ہے، دوسری چیز ہے، اور قرآن کا مخلوق ہونا جو ایک حقیقت نظمی و ترتیبی کا نام ہے بالکل دوسری ہے۔ قرآن حکیم کو کسی اعتبار سے بھی مخلوق و حادث نہیں کہہ سکتے، وہ نہ تو حرفوں کا نام ہے اور نہ اُن آوازوں کا جو انسان کے حلق سے نکلتی ہیں۔ "الحمد للہ رب العلمین" کا ہر حرف اور ہر لفظ اپنی انفرادی حالت میں جو آواز پیدا کرتا ہے ....

.... اور ان کی حرکات صوتیہ سے جو تموّج ہوا کے ذرات میں ہوتا ہے، یقیناً حادث ہے، لیکن ساتھ ہی وہ قرآن بھی نہیں ہے۔ قرآن تو اُس حقیقت نظمی کا نام ہے، جو ان حرفوں کی ایک خاص الٰہی ترتیب و تنظیم سے متشکل ہوئی۔ اور "الحمد للہ رب العلمین" بن کر لسان وحی پر جاری ہوئی۔ وہ قدیم ہے، اس لئے کہ خدا بھی قدیم ہے۔

اوراس سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے اتنا علم کافی ہے وہ مخلوق ہے یا قدیم؟ یہ سوال نہ تو خود قرآن نے ہمارے سامنے کیا، نہ اللہ کے رسول نے۔ نہ تربیت یافتگانِ عہدِ نبوت نے، پس جو کچھ ضروری تھا وہ وہی تھا جو بتلا دیا گیا، اور جو نہیں بتلایا گیا وہ ضروری ہی نہیں ہے اور اس کی فکر و کاوش میں ہمارے لئے کوئی سعادت نہیں۔

سلف صالح اور محدثین کرام کا یہی مسلک تھا اور صرف اسی راہ میں امن تھا، لیکن افسوس کہ مسلمان ان فتنوں سے نہ بچ سکے جو ان سے پہلے کی قوموں میں موجب ضلالت ہو چکے تھے۔

پھر قدم و حدوث کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے۔ تو مسئلہ بالکل واضح تھا، اور اس کی حقیقت ایک ہی تھی، اللہ اور اس کی تمام صفات کاملہ قدیم ہیں، اس کی ایک صفت کلام ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے پس حروف و اصوات و الفاظ کی جس مرتبہ و منظمہ شکل میں وہ موجود ہے اس کی حقیقت نظمی و ترتیبی کو بھی قدیم ہی ہونا چاہیئے۔

لیکن فلسفیانہ کاوشوں نے ایک بات کو پیچیدہ بنا کر نظر و بحث کی اور راہیں بھی کھول دیں۔ فرقہ معتزلہ نے جو فلسفہ و معقولات یونانی سے متاثر ہو چکا تھا، اس مسئلہ کو بالکل دوسری نظر سے دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس سے پہلے نہ تھا۔ وہ ایک با معنی عبارت ہے۔ عبارت جملوں سے مرکب ہے۔ جملے الفاظ سے، اور الفاظ حروف سے، یہ حروف

جن کے لئے ہمارے سلف اور علماء حق نے ایک عظیم الشان داخلی جہاد کیا، اور اکثر اوقات اپنی زندگیوں تک کی قربانی کر دی، محض ایک لفظی نزاع تھی، اور سوء فہم و کج ذہنی نے ان کو اہم و دقیع بنا دیا تھا۔

وہ ان لوگوں کی عقلوں پر تعجب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ عقلمند ہیں، کیونکہ ان بحثوں کی بے وقعتی و بے اثری کو خرد مندانہ محسوس کر رہے ہیں، لیکن افسوس کہ ہم ان سے متفق نہیں ہو سکتے یہ مسائل جس عہد میں پیدا ہوئے، وہ اسلام کی نشو ونمائے اجتماعی کا ابتدائی عہد تھا۔ اس کے سر چشمے پھوٹ کر بہہ رہے تھے، اور ایک تنکا بھی ان کی راہ میں آجاتا تھا تو خوف ہوتا تھا کہ یہی تنکے جمع ہو کر ایک دن بڑی بڑی نہروں کے دہانوں کو بند کر دیں گے۔ محدثین کرام نے اس حقیقت کو سمجھا اور اسلام کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہو گئے، ان کی مثال اس جانباز عاشق کی سی تھی، جو اپنے معشوق کے تلووں میں ایک کانٹے کی چبھن بھی دیکھتا ہے تو اس زور سے چیختا ہے۔ گویا اس کے پہلو میں خنجر نے شگاف کر دیا۔ وہ اس ایک ایک تنکے، ایک ایک کانٹے اور مٹی کے ایک ایک ذرّے کے لئے اپنی گردنوں کو ذبح کرا دینا چاہتے تھے، جو اسلام کی راہ میں آجائیں، اور اس کی صراطِ مستقیم کو آلودہ کرنا چاہیں، اگر اس وقت اللہ تعالیٰ فرزندانِ اسلام کی اس سب سے زیادہ برگزیدہ جماعت کے دلوں کو اپنے الہام سے معمور نہ کر دیتا، اور وہ ایک داخلی جہاد عظیم کر کے ان تمام فتنوں کا سدّباب نہ کرتے، تو آج دُنیا میں اسلام کی بھی

گلستاں کا ہر حرف اور ہر لفظ سعدی کا کلام نہیں ہے۔ لیکن گلستاں سعدی کی ہے۔ اس لئے وہ حقیقت جو الفاظ و حروف و اصولت کے علاوہ ہے، اسی کا نام گلستاں ہوگا، اور وہی سعدی کی تصنیف ہے۔

پس "قرآن" جس کتاب کا نام ہے وہ کسی اعتبار سے بھی مخلوق نہیں ہو سکتی۔ معتزلہ نے اسے مخلوق قرار دے کر ایک طرف تو اُن بحثوں کا دروازہ کھولا جو اسلام کے لئے سب سے بڑا فتنہ تھا، دوسری طرف قرآن کی الٰہی عظمت و قدوسیت کے اعتقادی آساس کو بھی سخت صدمہ پہنچنے کا امکان پیدا کر دیا۔ قرآن کی ربانی و الٰہی عظمت کا اعتقاد اسلام کی تمام کائنات زندگی کی اصلی روح تھی، پس اگر آغاز عہد ہی میں اس کی پوری حفاظت نہ کی جاتی تو بہت جلد وہ وقت آجاتا جب لوگ تورات اور انجیل کی طرح قرآن حکیم کی عزت الٰہی کو بھی غارت کر دیتے۔

اللہ تعالےٰ نے فرزندان اسلام کی سب سے بڑی مقدس و حامل شریعت جماعت یعنی محدثین کرام کو اس بدعت مضلہ کے انسداد کے لئے کھڑا کر دیا اور انہوں نے اپنا خون بہا کر اس مسئلہ کے دست برد سے قرآن حکیم کی حفاظت کی۔

مسئلہ کی اہمیت

آج کل کے بعض ارباب علم و نظر کا خیال ہے کہ اس قسم کی بحثیں

مخالفت کی اور کسی شکل میں بھی ان کو گوارا نہ کیا، واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ یکسر صحیح و واقعی تھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ انہی مسائل نے بالآخر اسلام کی حقیقی تعلیم کو طرح طرح کی خارجی ضلالتوں سے آلودہ کیا، اور ان کوششوں کے بعد بھی اسلامی عقائد غیر دینی اثرات و اختلاط سے محفوظ نہ رہ سکے۔ صرف محدثین کرام ہی کا ایک گروہ ایسا نظر آتا ہے جن کے دلوں کو اللہ نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ نہ تو انقلابات علمی کے مؤثرات ان کی استقامت حق پر غالب آسکے۔ اور نہ السنائی افکار و اوہام کی دلکشیاں ان کے دلوں کو جمال قرآن و سنت کے عشق سے پھیر سکیں۔ فی الحقیقت یہی وہ پاک جماعت تھی جس کے لئے زبان نبوت نے اول روز ہی حکم سنا دیا تھا۔ لا یزال طائفۃ من امتی قائمین علی الحق، حتیٰ یاتی امر اللہ وھم غالبون۔

بہر حال علماء حق اور محدثین کرام نے اس بدعت شدیدہ اور فتنۂ عظیمہ کا اس قوت و سرفروشی کے ساتھ مقابلہ کیا کہ تمام دنیا کی حق پرستی وامر بالمعروف کی تاریخ میں اس کے واقعات کی یادگار رہیں گے۔

اگر یہ مسئلہ صرف عامۂ معتزلہ تک محدود رہتا تو پیروان اسلام کے سواد اعظم کے لئے جو اس کا مخالف تھا، کوئی مصیبت نہ تھی یہ صرف بحث و دلائل کا میدان ہوتا۔ اور زبان و قلم کا جہاد اس کے لئے کافی تھا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ حکومت وقت نے اس مذہب کا ساتھ دیا، اور بعض خلفائے عباسیہ نے معتزلہ کے ساتھ ہو کر خلق قرآن کے مسئلہ کو

وہی حالت ہوتی جو دنیا کے تمام محرف و مسخ مذاہب کی نظر آرہی ہے، اور اس کی حقیقی تعلیم کو بھی طرح طرح کی بدعات و محدثات کا سیلاب بہالے گیا ہوتا۔

آج تمہارا حال یہ ہے کہ اسلام کی گردن پر تلواریں چلتی ہیں، تو تمہیں اتنا بھی صدمہ نہیں ہوتا۔ جتنا کسی انگلی کے پوئے میں سوئی کی خلش سے ہو سکتا ہے، تم ان پاک روحوں اور خدا کے کلمۂ حق کے جاں نثاروں کی حالت کا کیا اندازہ کر سکتے ہو؛ جو اس کی راہ میں ایک تنکے کے آجانے سے بھی اس طرح بے چین ہو جاتے تھے، گویا ان کے بستر پر دہکتے ہوئے انگارے بچھا دیئے گئے۔

قرآن حکیم کی جس حفاظت و عظمت پر تم آج ناز کرتے ہو، یہ دراصل انہی محدثین کرام کی حق پرستیوں کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے اس کو بھی گوارا نہ کیا، کہ کوئی نئی آواز قرآن کے لئے اُٹھائی جائے اور کوئی بات اس کی نسبت کہی جائے، جو اس کی غیر انسانی عظمت کی تنزیہ و تقدیس کو بٹہ لگائے۔

پھر اس سے بھی قطع نظر کرو۔ یہ مسئلہ محض ایک لفظی نزاع ہی کب تھا؛ معتزلہ کہتے تھے کہ قرآن مخلوق و حادث ہے۔ ہر مسلمان کو اس کا اعتقاد رکھنا چاہیئے۔ اور اس طرح قرآن کے لئے ایک ایسی بات کہتے تھے، اور ایک ایسی بات کا اقرار کرانا چاہتے تھے، جس کا اقرار نہ تو خود قرآن نے کرایا اور نہ رسول نے کچھ کہا۔ پھر کیا یہ ایک سخت فتنہ نہ تھا۔ جو نئی نئی اعتقادی بدعتوں کا ابلیسی دروازہ کھولتا تھا؟ اور کیا یہ شریعت پر حملہ کرنا اور اسلامی اعتقاد کی ترمیم نہ تھی؟

محدثین کرام نے جن مقاصد کی بنا پر اس طرح کے تمام فتنوں کی

قرآن کا فتنہ عظیمہ بھی ہے۔ جس نے تیسری صدی ہجری میں علماء حق کے لئے ابتلا و امتحان کا ایک نہایت نازک وقت پیدا کر دیا تھا۔ اس نے معتزلہ کا مذہب خلق قبول کر لیا۔ اور اسی کو حق و باطل اور اسلام و کفر کا معیار قرار دیا۔ اس نے چاہا کہ اپنی حکومت کے جبر و قہر سے لوگوں کو مجبور کرے، اور اس چیز کا اقرار کرالے جس کے لئے شریعت نے انہیں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے بھائی ابن الرشید کو قید خانہ کی کوٹھڑی میں قتل کرا سکتا تھا۔ اور یقیناً اس کے بھیجے ہوئے جلادوں کی تلواروں میں یہ قدرت تھی، کہ سکین ابن کے نکلنے کی ڈھال پر غالب آجائیں۔ لیکن اس کی پوری حکومت اور حکومت کی تمام طاقتیں بھی اس سے عاجز تھیں، کہ حاملین شریعت اور علمار حق کے استقامت و ثبات پر غالب آسکیں، اور ان کو حق و ہدایت کی اس راہ سے پھرا دیں، جس پر ان کا یقین اور نور ایمان انہیں چلا رہا تھا۔

تاہم فتنہ عظیم تھا۔ اور اس کے قہارانہ نتائج نے وہ سب کچھ کیا جو ایسے مواقع میں ہمیشہ ہوا ہے۔ بہت سے علمار حق قید ہوئے بہت سے جلا وطن کئے گئے، بعض خاک و خون میں بھی تڑپے، اور بہتوں کے قدم جادۂ ثبات سے ڈگمگا بھی گئے۔

فتنہ کی ابتدا

غالباً سب سے پہلے ۲۱۲ھ ہجری میں مامون الرشید نے

پیچھے پھیلانا چاہا۔ انھوں نے حکومت کے زور، سزاؤں کے اعلان قیدخانوں کی زنجیروں، اور جلادوں کی تلواروں کو حرکت دی اس لئے یہ علمی مسئلہ علمی نہ رہا، بلکہ ارباب حق کے ابتلاؤ آزمائش کی ہیبت ناک ہولناکی بن گیا۔

مامون الرشید کا استبداد

خلفائے عباسیہ میں مامون الرشید عباسی ایک عجیب وغریب حکمراں گذرا ہے۔ اس کی زندگی میں بعض چیزیں بالکل متضاد جمع ہوگئی تھیں وہ ایک طرف علوم اسلامیہ کا ماہر تھا، عربیہ کا کامل الفن تھا، علم وحکمت کا عاشق اور حریت وآزادی کا حامی تھا۔ اس کی حریت پسندی نے دُنیا کے تمام مذہبوں کو مطلق العنان چھوڑ دیا۔ الحاد آزاد تھا، ثنویت کی پرستش نہ تھی، مانویت علانیہ ظاہر کی جاتی تھی، مزوکیت کے لئے کوئی درّہ نہ تھا، یونان وایران کے جن ملحدانہ مذاہب کو کبھی بھی پناہ نہ ملی تھی۔ وہ بغداد کی گلی کوچوں میں پرورش پارہے تھے،

لیکن دوسری طرف اسلام کے اندرُونی مذاہب واختلافات کے میدان میں آکر دیکھئے، تو اس کے ہاتھ میں استبداد کی بے پناہ تلوار اور زبان پر جبر وقہر کے سخت سے سخت احکام نظر آتے ہیں!

مامون الرشید کے اسی استبداد داخلی کے سلسلہ میں مسئلہ خلق

وسطوت رکھتا تھا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا، اور قیدخانہ کی بیڑیاں خوشی پہن لیں۔

اس جماعت حق کا سرتاج وہ وجود مقدس و مبارک تھا جس کو شریعت کے احیاء و تجدید اور کتاب و سُنّت کے مسلک قویم کے اعلان و حفظ کی خدمت درگاہ الہٰی سے سُپرد ہوئی تھی۔ اور جس کی قربانی کو خُدا نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے روز ازل ہی سے چن لیا تھا، یعنی حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو فی الحقیقت تمام ائمہ سلف میں اپنی مخصوص فضیلتوں کی بنا پر ایک ہی شخص ہیں جن کو "امام اہل سُنت والجماعت" کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔

ہم کبھی آئندہ امام موصوف کی اس یادگار قربانی کا حال بہ تفصیل لکھیں گے، یہاں صرف اسی قدر اشارہ کر کے ایک دوسرے واقعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

جامع رصافہ

اس واقعہ کے بعد ہی مصائب و محن کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ اور تمام بغداد کانپ اُٹھا۔ علماء کے سامنے صرف دو ہی راہیں تھیں۔ یا اس چیز کا اقرار کریں، جس کا اقرار شریعت نے ان سے نہ کرایا، یا جلاد کی تلوار دیکھیں اور قیدخانہ کی زنجیروں سے ہم آغوش ہوں۔ بہتوں نے بغداد سے ہجرت کی۔ بہتوں نے گھر سے

خلق قرآن کے مسئلہ کا سرکاری طور پر اعلان کیا۔ اور دارالخلافتہ میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہوا لیکن جبر و تشدد کی ابتداء ۲۱۸ھ سے نظر آتی ہے۔ جبکہ مامون الرشید پوری قوت کے ساتھ آمادہ ہو گیا تھا۔ تلوار کے زور سے خلق قرآن کا مذہب مسلمانوں میں پھیلائے۔

چنانچہ اسی سنہ میں اس نے ایک فرمان اسحاق بن ابراہیم گورنر بغداد کے نام بھیجا۔ فرمان کا مضمون یہ تھا کہ تمام علماء شہر کو جمع کرو۔ جو لوگ خلق قرآن کا اقرار کریں۔ انہیں چھوڑ دو۔ جو انکار کریں، اُن کی نسبت خبر دو۔ پھر دوسرا فرمان بھیجا کہ بشر بن ولید الکندی قاضی القضاۃ ابراہیم بن مہدی اگر انکار کریں۔ تو قتل کر دیئے جائیں لیکن ان کے علاوہ دیگر منکرین خلق قرآن کو صرف قید کر دیا جائے۔

(ابو الفداء جلد دوم صفحہ ۳۱)

ابراہیم بن مہدی کے قتل کا تو پولیٹکل اسباب سے وہ خواستگار ہی تھا۔ لیکن بشر بن ولید کے لئے قتل کی سختی اس لئے تھی کہ وہ قاضی القضاۃ تھے۔ افسوس کہ ان دونوں کا ثبات اس پہلی آزمائش ہی میں ہلاک ہو گیا اور خلق قرآن کا اقرار کر کے اپنی جان بچا لی۔ اور بہت سی کمزور روحوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ لیکن علماء حق کی ایک مقدس جماعت ایسی بھی تھی۔ جس کے لئے حکومت کی تلواروں اور دنیوی عقوبتوں کے فرمانوں سے بڑھ کر خدا کا فرمان ہیبت و

یہ متوحش خبریں بہت جلد تمام عالم اسلامی میں پھیل گئیں۔ اور ہر شہر میں اسی فتنہ کا چرچا ہونے لگا۔

شیخ عبدالعزیز الکنانی

مکہ معظمہ میں اس وقت ایک عالم حق اور محدث عصر شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ کنانی تھے، انہوں نے جب اس فتنہ کا حال سُنا۔ اور مامون کے قہر و جبر، معتزلہ کے استیلاء، اور علماء کی خاموشی کی سرگذشتیں معلوم کیں۔ تو غیرت حق کے جوش اور امر بالمعروف کی رُوح ایمانی کے اضطراب سے بے اختیار ہو گئے، اور عزم بالجزم کر لیا، کہ اس فتنہ کے انسداد کی راہ میں اپنی زندگی قربان کر دیں گے، وہ اپنے رسالہ میں (جو خاص طور پر اسی واقعہ کی نسبت لکھا ہے۔ اور جس کا قلمی نسخہ جامع اموی دمشق کے کتب خانہ میں محفوظ ہے) لکھتے ہیں۔

اتصل بی و انا جلکتہ ما ابتلی بہ الناس فی بغداد وکیف استطال علیہم بشر المریسی ولبس علے امیر المؤمنین دعامۃ اولیائہ فاطار نومی، وخرجت من بلدی متوجہا الی ربی، واسألہ سلامتی حتی قدمت بغداد

میں مکہ میں تھا جب مجکو بغداد کے واقعات معلوم ہوئے، کہ کس طرح مسلمان ایک سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور کس طرح بشر مریسی ان پر سختیاں کر رہا ہے۔ اور کس طرح امیر المومنین اور ارکان سلطنت پر اس کا داؤ چل گیا ہے پس میں غفلت سے چونکا اور اپنے شہر سے

نکلنا بند کر دیا۔ بہتوں کی عزلت گزینی یہاں تک بڑھی کہ جمعہ کی جماعت کی شرکت بھی ترک کر دی، لیکن کسی کو اس کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کہ مامون الرشید کی سطوت وجلال کے مقابلے کے لئے اُٹھے اور اس جبر وقہر اور تسلط غیر شرعی سے اُسے روکے۔

مامون نے گزشتہ واقعات ہی پر قناعت نہ کی، بلکہ استبداد وجبر کا ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ بغداد کی سب سے بڑی مسجد "جامع رصافہ" تھی جو رصافہ کے شرقی جانب واقع تھی۔ اور جس کا صحن ہمیشہ علمائے ملت کے درس ومواعظ کی مجلسوں سے پُر رہتا تھا۔ مامون نے حکم دیا کہ فقہا اور محدثین میں سے کوئی عالم مسجد میں درس نہ دے، اور نہ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے۔ صرف بشر مریسی اور محمد بن جہم کے لئے یہ مناسب مخصوص ہے۔ جو اکابر معتزلہ، اور خلق قرآن کے دعاۃ میں سے تھے۔

انہی دونوں شخصوں کے ہاتھ تمام فقہاء ومحدثین کی موت وحیات کا رشتہ دے دیا تھا۔ جو عالم مسئلہ خلق قرآن کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان سے نکالتا تھا۔ پولیس اُسے گرفتار کر لیتی تھی۔ اور ان کے سامنے لے جاتی تھی۔ وہ جو حکم دیتے تھے اُس کی فوراً تعمیل کی جاتی علماء کا ایک بہت بڑا گروہ جو اپنے اندر سچائی کے لئے دُکھ اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ بظاہر ان کا ہمزبان بن گیا تھا۔ اور نفاق کی سپر یہ ان کی تلوار کو روکتا تھا۔

ساتھ ایک عجیب واقعہ دیکھا، ایک شخص جو اپنی صورت اور لباس سے مکہ کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلی صف میں کھڑا ہوگیا ہے، ایک چھوٹا سا بچہ اُس کے بالمقابل ایک ستون سے پیٹھ لگائے اس کی طرف نگراں ہے۔ اور بآواز بلند باہم سوال وجواب ہو رہا ہے:۔

اجنبی نے پکار کر پوچھا: "میرے بیٹے! قرآن کی نسبت تو کیا کہتا ہے:"

بچے نے پکار کر جواب دیا: "کلام اللہ، منزل، غیر مخلوق، اللہ کا کلام اُتارا ہوا، غیر مخلوق!"

آہ یہ چند لفظ تھے، جو ایک بچے کی زبان سے نکلے لیکن فی الحقیقت انہی کے اندر دعوت حق اور امر بالمعروف کی ایک کائنات ایمان مخفی تھی، یہ وہ صدا تھی، جس کے لئے اس وقت بغداد کا ایک ایک ذرہ پیاسا تھا۔ لیکن اس کی در و دیوار کو برسوں سے نصیب نہیں ہوئی تھی، صرف ایک بار اس جملہ کو کہہ دینا ہی وہ جہاد اعظم تھا جس کی فضیلت کے آگے ایک ہزار برس کی شب ہائے عبادت اور روز ہائے صیام بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے تھے!

اس لئے نہیں کہ خلق قرآن کا مسئلہ دعوت حق کی قوتوں کے خرچ کرنے کے لئے سب سے بڑا مصرف تھا۔ اور اس لئے بھی نہیں کہ اس صدا کے ایک بار بلند ہو جانے سے وہ جیل خانہ کھل جا سکتے تھے، جن کے اندر علمائے حق محبوس تھے۔ اور وہ زنجیریں ٹوٹ جا سکتی تھیں، جو امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح کے پاؤں

فشاهدت من غلظ الامر و امتداده اضعاف ما کان یتصل بی۔

نکلا۔ اللہ کی طرف میری نظر تھی اور اسی کے فضل و نصرت سے اپنی سلامتی کا خواستگار تھا۔ یہاں تک کہ بغداد تک پہنچ گیا۔ اور اپنی آنکھوں سے تمام حالت دیکھی مجھ پر روشن ہوا کہ معاملہ اس سے بدرجہا زیادہ سخت و پُر مصیبت ہے، جتنا میں نے سُنا تھا۔ انتہیٰ۔

ہم شیخ موصوف کے رسالہ سے اس سفر حق اور جہاد امر بالمعروف کے واقعات نقل کرتے ہیں۔

وُرود بغداد :- شیخ عبدالعزیز بغداد پہنچے۔ اور یہاں کے تمام حالات معلوم کئے۔ سب سے پہلے مرحلہ یہ تھا کہ وہ کسی طرح مامون الرشید کے دربار تک پہنچیں۔ اور اس مسئلہ کے متعلق امر بالمعروف کا فرض ادا کریں۔ لیکن اس میں بڑی ہی مشکلیں تھیں ہر قدم پر اس کا خوف لگا تھا۔ کہ کہیں مامون کے مقابلہ سے پہلے ہی گرفتار نہ کر لیئے جائیں۔ یا قتل کا فتویٰ نہ دے دیا جائے۔

وہ اللہ کی طرف جھکے، اس راہ میں اس کی نصرت غیبی سے مدد چاہی۔ اور ایک خاص تدبیر کر کے جمعہ کے دن جامع رصافہ میں پہنچے ان کا چھوٹا سا لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔

جامع رصافہ میں کلمۂ حق کا اعلان

نماز جمعہ ابھی تک ختم ہی ہوئی تھی، کہ لوگوں نے حیرت و تعجب کے

حاکم پولیس اور شیخ کی گفتگو!

اس سوال و جواب کی ایک ہی صدا نے تمام مسجد کے اندر تہلکہ مچا دیا۔ لوگ حیرت سے دم بخود ہو گئے۔ اور حیران ہو کر ایکدوسرے کا منہ تکنے لگے، بہت سے لوگ بھاگ گئے کہ اب کوئی بڑی ہی مصیبت آنے والی ہے۔ لیکن شیخ عبدالعزیز بے خوف و ہراس اپنی جگہ پر کھڑے تھے، اور ان کا لڑکا سامنے کے ستون سے ٹیک لگائے دوبارہ منتظر سوال تھا!

تھوڑی دیر میں کوتوال شہر سپاہیوں کی ایک جماعت لے کر مسجد میں پہنچ گیا۔ اور شیخ عبدالعزیز اور ان کے لڑکے کو گرفتار کر کے اپنے صیغہ کے رئیس اعلےٰ کے دفتر میں لے گیا۔ جس کو آج کل کی اصطلاح میں پولیس کمشنر کہنا چاہئے۔ اس وقت بغداد کا پولیس کمشنر عمرو بن مسعدہ تھا۔ دونوں میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:-

عمرو بن مسعدہ پولیس کمشنر:- "کیا تم پاگل ہو؟"

شیخ عبدالعزیز:- "نہیں"۔

عمرو:- "کسی نے تمہیں بہکایا ہے؟

شیخ:- نہیں۔

عمرو:- خودکشی کرنا چاہتے ہو؟

شیخ:- نہیں۔ الحمد للہ میں صحیح العقل ہوں۔ اپنے ہوش و

بس پڑی تھیں، بلکہ صرف اس لئے کہ جبر و استبداد غیر شرعی سے ایک کلمۂ حق کو کہنا جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ اور انسان کا ہاتھ بڑھ رہا تھا۔ تاکہ خدا کی کھولی ہوئی زبانوں کو بند کر دے، پس اس وقت زمین کے ہر اُس بسنے والے پر جو خدا کو جانتا اور خُدا کے رشتہ کو اپنے دل میں رکھتا۔ فرض ہو گیا تھا کہ اس انسانی جبر کو توڑے، اور خدا کی وفاداری کے لئے انسانی اطاعت سے سرکش ہو جائے۔

اس وقت برسوں کے کاموں اور صدیوں کے ارادوں کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف ایک ہی مقدس لمحہ کی جس کے اندر صدائے حق کی ایک نڈر آواز بلند ہو جائے، اس ایک آواز کا بلند کر دینا ہی اصلی کام تھا۔ اس کے بلند کر دینے کے بعد یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے کام کیا کیا؛ حق کا کہنا جب جرم ہو جائے۔ تو حق کہہ دینا ہی سب سے بڑا کام ہے۔

اگر شیخ عبدالعزیز کنانی اس کے بعد ہی قتل کر دیا جاتا جب بھی اس کے نام کی عظمت کا ایک ذرہ بھی نہ گھٹتا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الجہاد اعلائے کلمۃ حق عند سلطان جابر۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے زیادہ فضیلت والا جہاد کلمۂ حق ہے۔ جو کسی جابر بادشاہ کے مقابلہ میں کہا جائے۔

عمرو :۔ نہیں تمہارا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس واقعہ کے ذریعہ شہرت حاصل کرو۔ اور چونکہ تم اس کے نتائج سے ناواقف ہو۔ اس لئے حماقت سے سمجھتے ہو کہ یہ شہرت سبب رزق ہو جائے گی۔ اور لوگوں سے مال و دولت لوٹ سکوں گا۔

شیخ :۔ اگر اعلان حق کے سوا اور کوئی خیال میرے سامنے تھا تو وہ صرف یہ تھا کہ کسی طرح امیرالمومنین کے حضور تک پہنچوں۔ اور اُن کی موجودگی میں اس مسئلہ کی نسبت مدعیان خلق قرآن سے مناظرہ کروں۔

عمرو :۔ سبحان اللہ! اس کی بھی آپ کو جرأت ہے۔

شیخ :۔ تم کو میری خواہش پر تعجب کرنے اور حقارت کی نظر ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ تم امیرالمومنین کو سب سے بڑا سمجھتے ہو گے مگر میں خدا کو سب سے بڑا یقین کرتا ہوں۔

عمرو۔ اچھا یونہی سہی، پھر کیا تم تیار ہو کہ امیرالمومنین کے دربار میں اس عقیدہ کو ظاہر کرو۔ اور علماء سے مناظرہ کرو؟

شیخ :۔ الحمد للہ اللہ کی مدد سے بالکل تیار ہوں صرف ایک چیز ہے۔ جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا، اور میں نے دبدہ

حواس بیں ہوں اور علم و معرفت رکھتا ہوں۔

عمرو۔ کسی نے تم پر ظلم کیا ہے۔ تم مظلوم ہو؟

شیخ:- نہیں۔

عمرو بن مسعدہ نے کوتوال سے کہا۔ کہ اسے پوری نگرانی وحفاظت کے ساتھ میرے مکان پر پہنچا دو۔ سپاہیوں کی جماعت نے شیخ کو گھیر لیا۔ دو آدمیوں نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے اپنے ہاتھوں میں لے لئے، اور پولیس کمشنر کے مکان میں داخل ہوئے۔

عمرو بن مسعدہ (پولیس کمشنر) ان سے پہلے ہی مکان پر پہنچ گیا تھا۔ اور صحن میں ایک آبنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک نہایت ہی مکلف اور مطلا افسر پولیس کی وردی اس کے جسم پر تھی[1]۔ شیخ کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اس نے مزید تحقیق شروع کی۔

عمرو۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

شیخ:- مکہ معظمہ کا۔

عمرو:- آج مسجد میں تم نے جو کچھ کیا۔ اس سے تمہارا مقصد کیا تھا؟

شیخ:- طلبت القربة الى الله ورجاء الزلفى لديه!

(اللہ کے قرب کی طلب اور اس کی رضا کی امید!)

---

[1] شیخ عبدالعزیز نے اپنے رسالہ میں یہاں "شوار" کا لفظ لکھا ہے۔ شوار سے مقصود وہ خاص لباس ہے۔ جو اس زمانہ کے افسر فوج و پولیس کی سرکاری وردی ہوتی تھی۔

عمرو:۔ تمہارے خون کے حرام ہونے میں تو مجھے اب بھی شبہ ہے۔ جبکہ تم امیرالمومنین کے حکم کی علانیہ توہین کر چکے ہو۔

شیخ:۔ حکم صرف خدا اور اُس کے قرآن کا ہے۔

عمرو بن مسعدہ نے گھوڑا طلب کیا، اور کوتوال سے کہا کہ میں دربار کی طرف جاتا ہوں۔ تم شیخ اور اس کے لڑکے کو سپاہیوں کے حلقہ میں لے کر پیچھے پیچھے آؤ۔

شہر کی تمام مخلوقت ان عجیب وغریب باپ بیٹوں کو حیرت اور افسوس کی نظروں سے دیکھ رہی تھی، جنہوں نے موت کی تلاش میں بغداد کا سفر کیا تھا۔ اور اب اس کے منہ میں بے خوف وخطر جا رہے تھے۔

راہ میں اُنہوں نے لوگوں کی آوازیں سنیں جو کہہ رہے تھے

" دارالخلافہ میں باہر کے مسافر زندگی اور راحت کے لئے آتے ہیں۔ لیکن انہوں نے موت کے عشق میں اپنا گھر چھوڑا"۔

کیا واقعی ان دونوں نے موت کے لئے اپنے وطن عزیز کو چھوڑا تھا؟

ہاں، مگر اس موت کے لئے جو تمام اُمّت مرحومہ کو استبداد کی موت سے نجات دلا کر حریت حقہ کی زندگی بخشنے والی تھی! بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

دو انستہ ایک ایسے شدید خطرہ میں اپنے آپ کو اور اپنے عزیز بچے کی جان کو ڈال دیا۔ خدا کی مقدس کتاب کی عزت برباد ہو رہی ہے۔ اور اس کی نسبت اُس بات کا اقرار لیا جا رہا ہے۔ جس کا اقرار خدا اور اس کے رسُول نے نہیں لیا۔ مسلمانوں کی زبانوں کو خدا نے کھولا ہے۔ مگر تم بند کر رہے ہو، اور بغیر کسی جرم وقصور کے بندگانِ خدا طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ پس میں علم رکھتا ہوں۔ مجھے شریعت کی معرفت خدا نے عطا فرمائی ہے۔ میرا فرض ہے کہ اس فتنہ کے انسداد کی کوشش کروں۔ نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

عمرو۔ اچھی بات ہے۔ تم امیر المومنین کے دربار تک پہنچا دیئے جاؤ گے، لیکن اگر وہاں پہنچکر تم نے اپنا کوئی اور مقصد ظاہر کیا اور ثابت ہو گیا کہ اس مسئلہ کا اظہار محض ایک بہانہ تھا تو پھر؟

(اس مسئلہ کے خلاف بحث کرنے کے لئے دربار میں جانا اس وقت ایک ایسی عجیب بات تھی۔ کہ کسی طرح عمرو بن مسعدہ کو اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کوئی اور ذاتی مقصد ہے دربار تک پہنچنے کے لئے اس مسئلہ کو وسیلہ بنا لیا ہے۔)

شیخ :۔ اگر ایسا ہوا تو میرا خون تمہارے لئے حلال ہے۔

تمہاری کل کی جرأت کو معاف کر دیں۔"

جُرأت حق کی پہلی برکت اور خدا کی نصرت کا پہلا نظارہ دیکھو۔ کہ افسر شاہی جو اس لئے تھا کہ شیخ کو سزا دے، خود بخود اس پر اعتماد کرتا ہے۔ اور بغیر کسی کی ضمانت سے لئے رہا کر دیتا ہے۔ لن تنصروا اللہ، ینصرکم (اگر تم خدا کے کلمہ حق کی مدد کرو گے تو خدا بھی تمہاری مدد کرے گا)

مناظرہ کے دن

مامون الرشید نے تمام علماء دارالخلافہ کو پیر کے دن دربار شاہی میں حاضر ہونے کا حکم دے دیا۔ شیخ عبدالعزیز پیر کے دن قصر شاہی میں حاضر ہوئے۔ تو کوتوال کو اپنا منتظر پایا۔ وہ عمرو بن مسعدہ کے سامنے لے گیا۔ عمرو نے دیکھتے ہی کہا:-

"اُمید ہے کہ اب تمہیں عقل آگئی ہو گی۔ اور تم اس جنون سے باز آگئے ہو گے۔ جس کا نتیجہ قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہے تم امیر المومنین کے حکم و عقیدے کی اس سختی سے مخالفت کرنا چاہتے ہو۔ اس کا نتیجہ تلوار کے سوا اور کچھ نہ دیکھو گے۔ اب بھی اس حماقت سے باز آجاؤ۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ معافی دلا دوں گا۔ نیز شاہی انعام و اکرام اور جاگیر و ریاست

قصرِ شاہی بغداد کے شرقی حصہ میں تھا۔ یہ مجمع دجلہ کو عبور کرکے ایوان خلافت تک پہنچا۔ اور عمرو بن مسعدہ شیخ کو کوتوال کی حفاظت میں چھوڑ کر خود اندر گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد واپس آکر شیخ سے کہا۔

میں نے تمہارا حال امیر المومنین کی خدمت میں عرض کر دیا کہ تم مسئلہ خلق قرآن کی نسبت اُن علماء دار الخلافۃ سے مناظرہ کرنا چاہتے ہو جو خلق کے قائل ہیں۔ امیر المومنین نے اسے منظور فرمایا۔ پیر کے دن مجلس مناظرہ منعقد ہوگی۔ امیر المومنین خود بہ نفس نفیس شریک مجلس ہوں گے۔ اگر پیر تک کے لیے کسی شخص کو اپنی ضمانت میں پیش کرو۔ تو تمہیں رہا کر دیا جائے"

شیخ نے کہا۔ میں مسافر ہوں۔ کسی شخص سے یہاں جان پہچان نہیں رکھتا۔ کہ اس کی ضمانت پیش کر سکوں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں کہ ایک شاہی مجرم ہوں۔ میرے لیے کسے پڑی ہے کہ اپنی جان مصیبت میں ڈالے گا۔

عمرو نے کہا۔" خیر ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب تم اپنے عقیدے میں ایک خیال کو حق سمجھ کر اس کے لئے ایسی پُر خطر جرأت کر رہے ہو۔ یقیناً تم جھوٹ نہیں بول سکتے، تم جاؤ اور اپنے معاملہ پر غور کرو۔ اگر اب بھی تم اس جنون سے باز آجاؤ۔ تو تمہاری مسافرت پر رحم کرکے امید ہے کہ امیر المومنین

اطلاع دی۔ پھر شیخ کو ایک ایسی جگہ بٹھا دیا۔ جہاں سے وہ تمام آنے والے لوگوں کو دیکھ سکے۔ اور کہا کہ اجتماع کی تکمیل کے بعد تم حضرت شاہی میں طلب کئے جاؤ گے۔

شیخ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں۔ کہ عمرو کو میری ہلاکت کا اس درجہ یقین تھا۔ کہ باوجود میری طرف مایوس ہوتے کے ضبط نہ کرسکا۔ اور آخر میں پھر نصیحت کی:۔

فقد حرمت علی خلاصك جهدی وانت حريص علی سفك دمك جهدك! فقلت: یا عمرو! معونة الله اعظم والطف من ان ینسانی ومن یتوکل علی الله فهو حسبه!

میں نے تمہاری نجات وسلامتی کے لئے وہاں تک کوشش کی جہانتک میرے امکان میں تھا۔ مگر افسوس کہ تم اپنا خون بہانے کے لئے حریص ہو۔ اور اس کے لئے اپنی پوری قوت سعی صرف کر رہے ہو۔ میں نے کہا۔ اے عمرو! اللہ کی اعانت اس سے زیادہ بڑی اور مہربانی رکھنے والی ہے۔ کہ مجھے بھلا دے اور جس نے اللہ پر بھروسہ کیا، اس کو خدا بس کرتا ہے!

مناظرہ کا اہتمام اور ہیبت واجلال دربار

مامون الرشید نے مناظرہ کی تیاری کے لئے غیر معمولی احکام جاری کر دیئے تھے، اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک عجیب و

سے تم مالا مال کر دیئے جاؤ گے۔ کیونکہ تمہارے اندر شجاعت کا جوہر موجود ہے"

لیکن شیخ عبدالعزیز کے لئے یہ تمام باتیں بے سُود تھیں انہوں نے کہا۔ "حق مظلوم ہو گیا ہے۔ میں اسے پھر قائم کرنا چاہتا ہُوں۔ مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں تو مال و جاگیر کا ذکر کیا کرتے ہو۔"

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ   کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

عمر جوش تاسف سے کھڑا ہو گیا۔ اور کہا "افسوس تمہاری غربت پر اور صد افسوس تمہارے بچے کی یتیمی اور تمہاری بیوی کی بیوگی پر۔ میں تمہیں ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر تم ہلاکت کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہو!"

شیخ کی رُوحِ حق سے صدائے یقین اٹھی۔ "اللہ کی وہ نصرت و اعانت جو صرف حق اور خدمت گزاران حق کے لئے ہے۔ مجھے کبھی نہیں بھلا سکتی۔ اور اگر میرے لئے اللہ نے اپنی راہ میں موت ہی لکھ دی ہے۔ تو یہ شہادت ہے۔ پھر شہادت سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے جس کا ایک مومن کو عشق ہو!"

عمرو نے جب دیکھا کہ سمجھانا بیکار ہے، تو نصیحت ختم کردی اور مامون الرشید کو اُس کے آنے اور آمادۂ مناظرہ ہونے کی

ڈرا سکتی ہیں ؟"

میں حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم　　شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

شیخ عبدالعزیز نے دیکھا۔ کہ سب سے پہلے امرار بنو ہاشم کا گروہ نمودار ہوا۔ جن کے سیاہ عماموں کے طلائی شملے ہوا میں اُڑ رہے تھے، اور آفتاب کی روشنی میں ان کا سنہری رنگ اس طرح درخشندہ تھا۔ کہ نگاہیں زیادہ دیر تک نظارہ کی تاب نہیں لاسکتی تھیں۔ ان کی عبائیں بھی سیاہ تھیں۔ جن کو خلفار عباسیہ نے اپنا قومی لباس قرار دیا تھا۔ اور عباؤں کی سیاہی کے اندر سنہری ساز و براق اور طلائی قبضہ و میان شمشیر کی متحرک چمک اس طرح نظر آتی تھی، گویا ابر آلود آسمان پر بجلیوں کی مضطرب لہریں کوند رہی ہیں۔

اس کے بعد علمار و فضلار دار الخلافۃ کا مقدس جلوس تھا۔ جن کے لباس اور ساز و سامان سواری میں اگرچہ سونے چاندی کے تکلفات نہ تھے، اور ہر چیز سے سادگی اور بے تکلفی نمایاں تھی، تاہم ان کا عظیم الشان گروہ۔ غلاموں کے حلقے، خدام کا جاہ و حشم، مذہبی زندگی کا مقدس جاہ و جلال اور پر ہیبت و وقار چہرے بجائے خود ایک ایسی ہیبت رکھتے تھے، جو مصنوعی تکلفات و آرائش کے ساز و سامان سے بے نیاز تھی۔ اس جلوس میں سب سے پہلے بشر مریسی کی سواری تھی۔ جو اس وقت فرقۂ معتزلہ کا سب سے

غریب مناظرہ تھا۔ اس لئے تمام امرا و رؤسا، علما و فقہا، ارکان و وزرار، افسران فوجی و ملکی اپنے تمام سازو سامان جاہ وجلال کے ساتھ اس میں شریک ہونے کے لئے نکلے، عبدالعزیز کنانی نے ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے دیکھا کہ انسانی جاہ و جلال اور سطوت ہیبت کے بڑے بڑے مناظر یکے بعد دیگرے ان کے سامنے سے گذر رہے ہیں۔

وہ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:۔

عمرو بن مسعدہ نے مجھے ایسی جگہ بٹھایا، جہاں سے تمام آنے والوں کو اچھی طرح دیکھ سکوں۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ خاص امیرالمومنین کے حکم سے ایسا کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دربار میں جانے سے پہلے ہی دربار کے جاہ وجلال کی ہیبت مجھ پر طاری ہو جائے۔ اور میں دیکھ لوں کہ کیسی پُر ہیبت و سطوت مجمع کے سامنے مجھے جانا پڑے گا۔ اور آزادی و بے باکی کی زبان کھولنی پڑے گی؟ لیکن افسوس کہ وہ انسانی جاہ وجلال کے جلوے دکھلا کر ایک ایسے شخص کی آنکھوں میں ڈر اور ہیبت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جس کی نگاہوں کے سامنے رب السموٰت والارض کا لازوال جاہ وجلال موجود تھا، اور جو نگاہ خدا کی عظمت و قدوسیت کے جلووں میں محو ہو چکی ہو، اُس کو انسانوں اور انسانوں کے قیمتی کپڑوں اور آہنی تلواروں کی قطاریں کیا

لکھتے ہیں :-

ورکب القوم بالسلاح لاحداث الھیبۃ فی نفسی وسائر الناس الذین یو شك ان نفسھم۔

اور مسلح فوج کی اس لیے نمائش کی گئی تاکہ میرے دل پر وحشت وہیبت طاری ہوجائے۔ نیز اس خیال سے بھی کہ یں نے حکم سلطانی کو ٹھکرا کر اگر عام رعایا کے اندر کوئی مفسدانہ جوش پیدا کر دیا ہو، تو بھی اس فوجی نمائش سے مرعوب ہو کر دب جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے یہ سازوسامان صرف شیخ کو ڈرانے ہی کے لئے نہیں کیا تھا۔ بلکہ عام رعایا کے اندر مخالفانہ جوش پیدا ہوجانے کا بھی اُسے اندیشہ تھا۔ اس سے اندازہ کرو کہ ایک مسافر غریب الوطن اجنبی کی صرف ایک ہی صدائے حق نے ماموں الرشید اعظم کی اُس حکومت کو جو قیصر قسطنطنیہ کو" روم کا کتا" کہہ کر خطاب کرتی تھی۔ اور کتے کی طرح عاجزی کی زمین لوٹا دینے کی طاقت بھی رکھتی تھی، کس طرح لرزا دیا تھا؛ اور کس طرح دگھبرا کر اپنی فوجوں اور ان کی برہنہ تلواروں کی نمائش کر رہا ہے کہ کہیں اس غریب الوطن کی منقاومت میری مطیع رعایا کے دل سے میری ہیبت نہ نکال دے؛-

پھر اور زیادہ غور کرو اور دیکھو کہ یہ عبدالعزیز کون تھا؟ دُنیا کی پادشاہت اس کے پاس کتنی تھی؛ خزانہ و فوج میں سے کیا رکھتا

زیادہ نامور رئیس تھا۔ اس کے بعد دارالخلافہ کا قاضی القضاۃ اپنے جاہ وحشم۔ ریاست کے ساتھ جلوہ آرا تھا۔ پھر تمام قضاۃ وارباب افتار کی جماعت تھی، ان کے بعد متکلمین و فقہاء اور ارباب درس وعلوم کا سلسلہ۔ لیکن ان سب میں زیادہ نمایاں حصّہ فرقۂ معتزلہ کے علماء کا تھا۔ اور جو علماء معتزلہ میں سے نہ تھے۔ وُہ بھی اقلاً مسئلہ خلق قرآن میں سرکاری حکم کے آگے سر اطاعت جھکا چکے تھے۔

اس نظارۂ تقدس کے بعد وُزراء و ارکان سلطنت کا پُرعظمت نظارہ تھا۔ ان کے عمامے بھی سیاہ تھے۔ مگر طلائی شملوں کی جگہ عماموں کے بالائی پیچ پر ایک مطلا حاشیہ لگا تھا۔ اور اس احتیاط سے لپیٹا گیا تھا کہ عمامے کا نصف زبریں تطر طراز شعاعیں کا ایک سنہری دائرہ بن گیا تھا۔ ان کے گھوڑوں کے ساز و براق بھی مطلا تھے، اور سنہری وردیوں سے ملبوس غلاموں کا شاندار حلقہ ہر سوار کے گرد و پیش جلوہ فروش عظمت و جلال تھا۔

اعیان حکومت کے بعد افسران فوجی کی سب سے زیادہ مؤثر اور ہولناک ہیبت تھی۔ جو اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ محل شاہی کی طرف آ رہے تھے، اور ان کی برہنہ تلواریں، رو بآسمان نیزے طرح طرح کے اسلحہ جنگ، ایک آہنی سمندر کی طرح متلاطم نظر آتے تھے۔

شیخ عبدالعزیز اس فوجی نظارۂ دہشت کا ذکر کرتے ہوئے

فرمان اعظم کا حکم ہے۔

اولئك كتب في قلوبهم الايمان وايدهم بروح منه ويدخلهم جنات تجرى من تحتها الانهار خالدين فيها، رضى الله عنهم ورضوا عنه، اولئك حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون - (۵۸: ۲۲)

یہی وہ راست باز انسان ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے اپنے ایمان کا نقش جما دیا، اور اپنی روح نصرۃ و فتحمندی سے ان کی مدد کی، پس اب خوف و ہراس اور ناکامی و نامرادی ان کے لئے نہ رہی، وہ ان کو بہشتوں کی بہشتی زندگی میں داخل کرے گا۔ وہاں باغ و چمن کا دائمی عیش ہے۔ اور نہروں کی روانی کا نظارہ راحت اندوز۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہ اللہ کی جماعت ہے۔ اور یقین کرو کہ اللہ کی جماعت ہی فلاح اور مراد پانے والی ہے۔

پس شیخ عبدالعزیز کے وجود غربت و فلاکت کے اندر جو ہیبت و اجلال پیدا ہو گیا تھا، اور جس نے مامون اعظم کو اپنی فوجوں کے نکالنے اور تلواروں کے چمکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ شیخ عبدالعزیز کی ہیبت نہ تھی۔ جس کو تلوار کی ایک حرکت دو ٹکڑے کر دے سکتی تھی، وہ خدائے عبدالعزیز کی ہیبت تھی۔ وہ حق پرستی اور ایمان اللہ کی قہاریت تھی، وہ جرأت ایمانی اور سطوت روحانی کا نا ممکن التسخیر اجلال تھا۔ کما قال فی المثنوی۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

تھا، کتنے غلام اس کی رکاب کو تھامتے تھے، کتنے محل اس نے اپنی آسائش کے لئے تعمیر کئے تھے؛

آہ! دُنیا کے ان تمام سامانوں اور دنیوی جاہ و جلال کی ان تمام نمائشوں میں سے تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایک تنہا مسافر جس کو بغداد بھی کسی نے چھوڑا دن تھا۔ ایک غریب الوطن فقیر جس کا شہر بھر میں ایک بھی ساتھی اور حمایتی نہ تھا۔ ایک اجنبی محض جس کے جسم پر مسکینی کے لباس اور غربت کی فقر نمائی کے سوا اور کچھ نہ تھا، با ایں ہمہ اس کے پاس ایک ایسی طاقت تھی جس کی فرماں روائی و ملوکی کے آگے مامون الرشید کی پوری سلطنت بھی ہیچ تھی۔ اور جس کے جاہ جلال کے آگے اس کی وہ سطوت و ہیبت بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی جس سے قیصر روم ڈرتا اور شاہ فرانس لرزتا تھا۔ یہ طاقت نہ تو تخت شاہی کے اوپر پیدا ہوتی ہے اور نہ شہنشاہی کے عظیم الشان قصروں اور محلوں میں اس کا گھر انسان کا ٹوٹا دل ہے۔ اور اس کا محل ایمان باللہ کی زخمی روح ہے۔ بادشاہ کا تخت جسم پر حکم کر سکتا اور لوہے کی تلوار گردن کی رگوں کو کاٹ سکتی ہے۔ پر نہ تو اس طاقت الٰہی کے آشیانے کو اُجاڑ سکتی ہے۔ اور نہ اس کی اقلیم سلطنت پر اس کی فرماں روائی چل سکتی ہے۔ وہاں صرف خدا ہے۔ اس کا ایمان ہے، اس کے کلمۂ حق کی خسروی ہے۔ اس کی صداقت و راستی کی ملوکی ہے۔ اور حق و معرفت کے ایک ہی

صاحب الستر

یہاں تک کہ " صاحب الستر" یعنی رئیس حجاب کا ایوان خاص آگیا۔ عہد عباسیہ میں " صاحب الستر" کا عہدہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا آج کل یورپ میں (LORDCHAMBAR LAIN) یا اٹر کی میں " وزیر تشریفات " کا ہے۔ یعنی شاہی ملاقات و حضور کا متوسط و وسیلہ۔ اس کو " حاجب " بھی کہتے تھے۔ اور یہ قصر شاہی کا وہ آخری برزخ ہوتا تھا۔ جس کے بعد خلیفہ کے حضور میں کوئی شخص پہنچ سکتا تھا۔ اسلام نے جب خلیفۂ وقت کے لئے کوئی محل ہی نہ بنایا، تو اس کے دروازے کے لئے دربان کہاں سے آتا؟ اس لئے خلفائے راشدین کا تمام عہد اس عہدہ سے خالی رہا۔ سب سے پہلے امیر معاویہ نے دہلیز شاہی کی بنیاد ڈالی، اور شاہانِ عجم کی روائتیں سُن کر حاجب کا عہدہ اس کے لئے قرار دیا۔[1]

حاجب صحن دربار تک لے گیا۔ صحن کے دونوں جانب کمروں کا ایک سلسلہ تھا جس میں مخصوص وزراء و ندماء اذن حضور تک ٹھہرتے اور انتظار کرتے تھے، یہاں پہنچکر شیخ سے حاجب نے پوچھا۔

" آپ کو وضو کے تجدید کی خواہش ہے؟"

---

[1] الاستیعاب میں حافظ عبد البر نے اس کی تصریح کی ہے۔ نیز تمام مورخین اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُوْمِنِیْنَ ہ

داخلہ

جب تمام ارکان و شرکار مجلس مناظرہ آچکے، تو شیخ عبدالعزیز کی بھی طلبی ہوئی۔ ایک کے بعد ایک متعدد دہلیزیں تھیں۔ جن سے شیخ کو گزرنا پڑا۔ سلطانی دہلیزوں کے مرحلہ کے بعد ایوان ہائے خلافت کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جن میں سے ہر ایوان ایک پوری شہنشاہی کے سازوسامان شوکت و ابہت سے معمور تھا، اور ہر ایوان کے خاتمہ پر اس کا پہلا رہنما رخصت ہوجاتا۔ اور نیا ہاتھ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا تھا۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے مرحلے آئے جن کی تمام جزئیات شیخ نے لکھی ہیں۔ اور ان سے زیادہ خطیب بغدادی وغیرہ مورخین عہد عباسیہ کی روایتوں سے واضح ہوتی ہیں۔ لیکن سرگزشت کا یہ تمام حصہ دولت عباسیہ کے جاہ وجلال سلطنت کے کارخانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر ہم اس وقت مضطرب ہیں کہ مجلس مناظرہ تک جلد سے جلد پہنچیں اور انسانی حکومتوں کے جاہ وجلال کی جگہ ایک داعی حق کے جاہ وجلال خداوندی کا جلوہ دیکھیں۔

سے متأثر نہ ہو۔ ؎۱

تمام خدام و متعلقین دربار کو چونکہ شیخ کے متعلق معلوم تھا کہ یہ شاہی مجرم ہے۔ اور اس نے موجودہ عہد حکومت کا سب سے بڑا گردن زدنی جرم کیا ہے۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ مان کے حضور میں جس قدر سختی اور بے احترامی اس کے ساتھ کر سکتے ہیں کریں، اور اسے محترم لوگوں کی طرح دربار میں نہ لائیں چنانچہ اس موقع کے متعلق شیخ عبدالعزیز اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:۔

؎۱ مامون الرشید تخت پر نہیں تھا کیونکہ یہ مجلس مناظرہ تھی، اور ہارون الرشید سے لے کر معتضد باللہ تک خلفائے عباسیہ کا یہی قاعدہ رہا کہ علمی مجالس میں ہمیشہ مثل اور شرکاء مجلس کے فرش ہی پر بیٹھتے تھے۔ البتہ صدر ایوان میں اُن کی جگہ اور مغرق لبطلا قالین مخصوص تھا۔ ڈاکٹر جی سلیمان (G. SAIMON) نے ابو بکر خطیب بغدادی کی تاریخ مدینۃ السلام کا ٹکڑا ایڈٹ کر کے چھاپا ہے۔ اُس میں ایک خاص عنوان خلفائے عباسیہ کی مجلس علمیہ کے متعلق بھی ہے۔ اس میں تشریح کر دی ہے کہ ہارون اور مامون جب کبھی کسی مجلس مناظرہ و محادثہ علمیہ میں یا بیت الحکمتہ میں آتے تھے، تو عام علماء و حکماء کی طرح خود بھی فرش پر بیٹھتے تھے۔ اور مامون کا تو یہ حال تھا کہ بسا اوقات اپنے معتمد علماء کو صدر میں اپنی جگہ دے دیتا تھا۔

شیخ نے کہا۔ "نہیں"۔

حاجب نے کہا۔

تو قبل اس کے کہ آپ امیر المومنین کے حضور میں پہنچیں دو رکعت نماز نفل پڑھ لیجئے۔

شیخ نے نماز پڑھی، اور جب نماز پڑھی تو یہ کہنا غیر ضروری ہے۔ کہ کس عالم میں پڑھی۔ اور اپنے اُس خداوند قدوس کے حضور میں کیونکر کھڑے رہے، جس کے کلمۂ حق کے لئے عنقریب ایک انسانی شہنشاہی کے حضور میں جانے والے تھے۔

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ۔

ایوان دربار

اب پردہ اُٹھا اور شیخ نے یکایک دیکھا۔ کہ کرۂ ارضی کے موجودہ عہد کا سب سے بڑا شہنشاہ (مامون اعظم) اس کے سامنے ہے۔

یہ نگاہوں کو خیرہ کر دینے والا ایک آفتاب نصف النہار تھا۔ جو یکایک ابر کے نقاب سے باہر نکل آیا۔ اور ایک غریب الوطن اجنبی کے لئے بہت مشکل تھا۔ کہ پہلی نظر میں اس نظا۔

نو کبھی اس سے پہلے میں نے محل شاہی کو دیکھا تھا، نہ کبھی اس میں قدم رکھا تھا میری معلومات بھی امیرالمومنین کے دربار کے متعلق بہت تھوڑی تھیں۔ انتہیٰ۔

علماءِ حق کے اس صدق بیان اور راستی فطرۃ کو دیکھ کر شیخ عبدالعزیز کس طرح صاف خود اپنے قلم سے کمزوری کی سرگذشت لکھ رہے ہیں۔ جو اس موقع میں ان سے ظاہر ہوئی۔ اور اس دربار میں پہنچکر جس کے جلووں نے قیصر روم کے ایلچی کو اپنے عہد تنزل میں بھی مبہوت و لایعقل کر دیا تھا۔ وہ باوّل نگاہ اپنے ضبط و تمکین کو قائم نہ رکھ سکے؛ لہ

لہ۔ المقتدر باللہ عباسی کے زمانے میں قیصر روم نے بعض معاملات کے انجام دینے کے لئے ایک سفیر بھیجا تھا۔ جس سے خلیفہ موصوف نے "قصر حسنیٰ" میں ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کی تفصیلی حالت خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سفیر دہلیز میں قدم رکھتے ہی بالکل مبہوت ہو گیا۔ ساز و سامان سلطنت دیکھکر اُس کے ہوش و حواس میں آ جاؤں۔

اللہ اللہ انقلاب زمانہ کی نیرنگیاں! ایک زمانہ وہ تھا کہ روم کا سفیر ہمارے دربار میں آتا تھا۔ اور ہماری عظمتوں کو دیکھکر بیہوش ہو جاتا تھا آج خود ہم غیروں کے ساز و سامان کو دیکھکر شدت مرعوبیت کو دیکھکر بیہوش ہو جاتا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۵۲ پر)

فازاح الستر واخذ الرجال
بيدى وعضدى، وجعل
اقوام ايديهم فى ظهرى
وعلى رقبتى وطفقوا يعدون
بى، فنظر الى المامون وانا اسمع
صوته "خلوا عنه" وكثر الضجيج
من الحجاب والقواد بمثل ذلك
فخلوا عنى وقد كاد يتغير عقلى
من شدة الجزع وعظيم
ما رايت فى ذالك الصحن
من السلاح، وهو مدع
الصحن وكنت قليل المجرة
بدار امير المومنين، ما
رايتها قبل ذلك ولا
دخلتها۔

پردہ ہٹا اور خدام بارگاہ نے میرے
ہاتھوں اور بازوؤں کو پکڑ لیا، وہ
اس طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے کہ ان کا ہاتھ
میرے سینے پر تھا۔ اور ایک کاندھے پر
انہوں نے اس طرح سختی اور بے حرمتی
کے ساتھ چاہا کہ مجھے اندر لے جائیں
مگر اسی وقت مامون الرشید کی
نگاہیں مجھ پر پڑیں اور میں نے اس کی
آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے۔
"اسے چھوڑ دو" مامون کے کہنے کے ساتھ
ہی لوگوں نے بھی اس کی تعمیل میں
"چھوڑ دو۔ چھوڑ دو" غل مچایا اور
بے شمار آوازیں ایک ساتھ بلند
ہوگئیں۔ حکم شاہی پاتے ہی خدام و حجاب
نے مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن دربار شاہی کے
اچانک نظارے، خدام و حجاب کی اس دار و گیر، اہالیان دربار کی صداؤں کے ہنگامہ
برہنہ تلواروں اور اسلحہ جنگ سے بھرے ہوئے صحن کی ہولناکی نے
میرے ہوش و حواس پر نہایت اثر ڈالا، اور قریب ہوا کہ شدت ہراس
اور ہیبت نظارہ سے میری عقل متغیر ہو جائے۔ اور میرا حال یہ تھا کہ نہ

پیر تک اُن کو دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد کہا۔" اور آگے آؤ۔" شیخ آگے بڑھے، پھر کہا "آگے آؤ۔" شیخ اور آگے بڑھے، تیسری مرتبہ پھر اسی حکم کو دُہرایا۔ شیخ بالکل قریب چلے گئے۔ صاحب الستر بھی ساتھ تھا۔ اور بتدریج اُن کو آگے بڑھاتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں اور مامون الرشید میں صرف اتنا فاصلہ رہ گیا کہ دو آدمی درمیان میں بیٹھ سکتے تھے، شیخ اپنی جگہ پاکر بیٹھ گئے۔ مگر اب تک ان کے دل میں ہیبت و رُعب کے اثرات باقی تھے۔

صاعقۂ حق کی پہلی گرج

شیخ جونہی اپنی جگہ بیٹھے ایک طرف سے صدا آئی۔

اس کے لئے تو صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ قبح اللہ وجھك (عربی میں تذلیل و تحقیر کی ایک گالی ہے) خُدا کی قسم میں نے اپنی پُوری عمر میں کسی شخص کو اس قدر بد صُورت نہیں دیکھا۔"

شیخ لکھتے ہیں۔ کہ میں نے اس آواز کو سُنا۔ لیکن اب تک میرے دل میں ہیبت و ہراس کا تھوڑا بہت اثر باقی تھا۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ حتیٰ کہ کہنے والے کی طرف میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

اس کے بعد مامون الرشید کی طرف متوجہ ہوا۔ اور شیخ کا نام، خاندان، ابوبیت، جدیت، قبیلہ، وطن، محلہ، مکہ معظمہ کے

بہر حال شیخ کو حجاب کے جبر و قہر سے نجات ملی۔ اور دربار کے دروازہ سے چند قدم آگے بڑھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مامون الرشید کی آواز برابر میرے کانوں میں آرہی تھی ۔
" ادخلوہ و قربوہ " اسے اندر لاؤ۔ اور مجھ سے قریب کرو چنانچہ وہ بلا تامل آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس عہد کی زمین کے سب سے بڑے پادشاہ کو اپنے سامنے دیکھا۔ اور بغیر کسی عجز و انحناء کے باآواز بلند کہا۔" السلام علیک یا امیر المومنین و رحمۃ اللہ و برکاتہ " مامون نے جواب دیا۔" وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔" اور ساتھ ہی ایک لمحہ تک سر سے لے کر

آج خود ہم بغیروں کے ساز و سازوں کو دیکھکر شدت مرعوبیت سے بے عقل و حواس ہوگئے ہیں۔ اور ان کو طاقت کا ایک دیوتا سمجھکر اللہ کی طرح پوج رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ہیبت دہر اس کے سوا کبھی خود ارانہ احساس کا ایک لمحہ بھی ہمیں میسر نہیں آتا۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک انتہا ہے یہ!

آگ کے شعلے بجھ جاتے ہیں۔ لیکن راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں دبی دبائی باقی رہتی ہیں۔ اور ہوا کے ایک جھونکے سے بھڑک اٹھتی ہیں۔ پھر کیا اس چولہے کی چنگاریاں کبھی نہ بھڑکیں گی ؟ کیا طوفان حوادث و تغیرات کا کوئی جھونکا ادہر سے نہیں گذرے گا ؟

وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ھو الولی الحمید۔

تقریر شروع کی :۔

"یا امیر المومنین! میں ایک فقیر الحال طالب علم ہوں۔ اپنے وطن اور خانۂ خدا کے مقدس جوار میں تھا۔ کہ میں نے خلیفۂ وقت کے مظالم و جبر کی دردانگیز سرگذشت سُنی۔ مجھے معلوم ہُوا کہ حق مظلوم ہوگیا۔ سُنّت کی روشنی بجُھ گئی ہے۔ بدعت کی آندھیاں زور شور سے چل رہی ہیں۔ حق کا کہنا جرم ہوگیا ہے۔ اور باطل پرستی کے صلہ میں جاہ و عزّت کی بخشش ہو رہی ہے۔ جس چیز کا اقرار خُدا نے تعالےٰ نے اُمّت مرحومہ سے نہیں کرایا۔ جس کی گواہی اس کے رسولوں نے نہیں دی۔ جس کا اعلان خلفائے راشدین نے نہیں کیا۔ جن کی خلافت طریقِ نبوت پر تھی۔ اور جس کے لئے کسی ایک صاحب رسول اللہ کی زبان کو بھی حرکت نہیں ہوئی۔ اس چیز کے اقرار کو آج ایک انسان ہر مومن کے لئے شرط قرار دے رہا ہے جو ہارون الرشید کے گھر میں پیدا ہوا اور وہ ہادی کا لڑکا تھا۔ اُس نے نہ تو تابعین کو پایا نہ اصحاب رسول اللہ کو دیکھا۔ نہ عہد نبوّت کی برکتوں میں اس کا کوئی حصّہ ہے۔ تاہم وہ شریعت الٰہی کے اس مخفی راز کو جانتا ہے۔ جس کو تابعین نے نہ جانا۔ اگرچہ دنیا سے مومن گئے، صحابہ نے نہ جانا۔ اگرچہ کفر کی چھینٹ بھی ان پر نہ پڑی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے کچھ نہ کہا۔ حالانکہ صاحب وحی رسالت تھے۔"

بنو ہاشم کے حالات، اور اس قسم کی بہت سی باتیں دریافت کیں۔ جن کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کہا:۔

"تمہارا بغداد میں آنا اور جامع رصافہ میں کھڑے ہو کر میرے ایک حکم دینی و شرعی کو توڑنا، اور خدا کی صفات میں دوسری چیز شریک کرنا۔ اور پھر مناظرہ کی خواہش کرنا یہ تمام حالات میں نے سُنے ہیں۔ اور اسی لئے علماء دارالخلافہ کو میں نے آج مدعو کیا ہے۔

شیخ لکھتے ہیں کہ "مامون الرشید کا یہ جملہ کہنا کہ تم نے خدا کی صفات میں دوسری چیزوں کو شریک کیا، میرے لئے رحمتِ الٰہی ہو گیا۔ مجھ پر دربار کی ہیبت کا اثر اب تک باقی تھا۔ مگر مسئلہ خلقِ قرآن کی نسبت جب یہ قول باطل میں نے سُنا۔ تو معاً دل کے اندر ایک آگ بھڑک اُٹھی۔ اور دعوت حق کی غیرت سے میں معمور ہو گیا۔ ساری ہیبت و دہشت یک قلم کافور ہو گئی اور میں دو بدو جواب دینے اور امر بالمعروف کا فرض ادا کرنے کے لئے بالکل مستعد ہو گیا۔

مامون کے جملے ابھی پورے ختم بھی نہیں ہوئے تھے۔ کہ شیخ کی آواز بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کی طرح ایوان دربار میں گونج اُٹھی۔ تمام اہل دربار اس مبازرت اور بے باکی پر ٹوکتے رہے، مگر اس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ اور جس طرح ایک معمولی اور حقیر انسان سے کوئی خطاب کرتا ہے۔ کڑکتی ہوئی آواز میں

"آہ تم ہوا کا وہ جھونکا ہو جس سے شریعت کی آگ تو نہ روشن ہو سکی۔ مگر اس نے سُنّت کے چراغوں کو گل کر دیا۔ تم سیلاب خلافت کی وہ رَو ہو، جو بدعات و محدثات کی خس و خاشاک کو تو نہ بہا سکے مگر اس نے حق پرستی کے تناور درختوں کو گرا دیا تم امارت و سیادت کی وہ تلوار ہو جو بطلان و ناحق کوشی کی فوجوں کو تو نہ قتل کر سکے۔ پر اس نے ارباب حق کے سروں کو اپنی پُرتش و روانی کا تختۂ مشق بنایا۔ اب تک تمہارا دعویٰ رسُول کی جانشینی کا رہا تھا۔ مگر اے مامون بن ہارون! تو اب رسُول کی جانشینی ہی کا نہیں بلکہ رسول سے زیادہ حق رسالت کا مدعی ہو گیا ہے۔ رسول خدا نے اُمت سے اس کا اقرار کبھی نہیں کرایا، کہ وہ کلام اللہ کو غیر مخلوق کہیں، مگر تیرے نزدیک کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ بطلان کے اس کلمہ پر ایمان نہ لائے تو نے صرف اس جرم پر کہ ارباب حق نے صراط مستقیم سے انحراف نہ کیا جو خدا کے رسول اور اُس کے تربیت یافتوں نے ان کے آگے کھول دی ہے۔ اپنے جبر و جور کی تلوار میان سے کھینچی، اور انہیں کافروں کی طرح قیدخانوں میں قید کر دیا، رسول اللہ کی سُنّت کے اتباع کے لئے تیرے پاس سزا و عقوبت ہے۔ اور بدعت و ضلالت کے لیے پیشوائی و سیادت کی عزت! خدا کے رسول نے ذہنوں

شیخ عبدالعزیز اب وہ عبدالعزیز نہ تھا جس کو عمرو بن مسعدہ نے کوتوالی میں اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔ اور جو دربار مامونی کے دروازہ میں قدم رکھتے ہی اس کی ہیبت رجلال سے لرز اٹھا تھا۔ اب وہ ایک دوسری ہی رُوحِ حق تھی۔ جو دُنیا کی تمام جسمانی طاقتوں اور عظمتوں سے ارفع داعلیٰ ہوکر صرف رب السموٰت والارض کی قدوسیت سے فیضیاب جلال و قہاریت تھی، اور مامون الرشید اگر تمام کرۂ ارضی کی بکھری ہوئی طاقتوں کو جمع کر کر اپنے سامنے لے آتا، جب بھی اس صدا کی گرج کی تاب نہیں لاسکتا تھا!

شیخ کے جوش و خروش، بے باکانہ طرز بیان، مساویانہ مقابلہ اور ہنگامہ ساز آواز کی ہولناکیوں نے اس تمام مجمع کو اس طرح دم بخود کر دیا۔ کہ (حسب تشریح شیخ) کسی کو روکنے یا ٹوکنے کا ہوش نہ تھا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے خود مامون الرشید اعظم کا اس حقارت کے ساتھ ذکر کیا۔ جب بھی نہ ان حجاب وخدام بارگاہ کی تلواروں کو حرکت ہوئی۔ جو اسے دھکیلتے ہوئے دربار میں لا رہے تھے۔ اور نہ ان امرا اور رؤساء کی زبانیں ہلیں، جنہوں نے اس کے کم رو چہرے کی حقارت کی تھی! اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔

شیخ نے اپنی تقریر جاری رکھی :-

اور شہنشاہوں کی طرح حکمرانی کر رہا ہے، گویا بغداد کے تخت پر مامون کی جگہ اس کو بٹھا دیا گیا ہے، اور ایوانِ دربار کے اندر اور باہر جو کچھ ہے۔ وہ مامون الرشید اعظم کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی کے لئے ہے!

اور پھر دیکھو کہ ان چند لمحوں کے اندر کوئی چیز بھی نہیں بدلی۔ وہی مامون ہے۔ وہی اُس کا تاج و تخت ہے۔ وہی اُس کے ارکان و وزراء ہیں۔ وہی فوجیں ہیں، وہی ان کی بے نیام تلواریں ہیں، وہی مجلس مناظرہ ہے، اور وہی عبدالعزیز کا جسم حقیر و وجود تنہا، لیکن صرف ایک چیز بدل گئی، یعنی عبدالعزیز کا دل اور اس کی ایمان و حق پرستی کی رُوحِ الٰہی۔ اس ایک حقیقت کے بدلنے کے ساتھ ہی تمام کائنات جسم و طاقت میں بھی انقلاب عظیم ہو گیا۔ جو انسان قہر کے لئے تھے، خود مقہور ہو گئے۔ جو زبانیں حکم کے لئے تھیں۔ خود محکوم ہو گئیں۔ جو ہاتھ عتاب کے لئے تھے، خود معتوب ہو گئے۔ جو آنکھیں سحر و ساحری کے لئے تھیں۔ خود مسحور ہو گئیں۔ اور جو عظمتیں کسی سے سجدہ خواہ تھیں۔ اب خود ہی کسی عظمت اعلیٰ و رفعت کبریٰ کے آگے ـــــ مسجود ہو گئیں! صن لہ الموطیٰ فاف-ا لکلی!

شیخ نے تقریر جاری رکھی اور خلافت اسلامی اور اُس کے

کو امان دی ہے۔ مگر تیری خلافت میں مسلمانوں کے لئے امان نہیں ہے۔ اے مامون! اللہ سے ڈر، اس کے عذاب کی پکڑ سے کانپ جس میں بہت ڈھیل ہے۔ مگر جس سے کبھی چھٹکارا نہیں۔ وہ زمین کے ائمہ و خلفاء کو تلوار بخشتا ہے۔ تو ان سے چھین بھی لیتا ہے۔ تم سے پہلے دمشق کے ائمۂ جور نے مسلمانوں کا خون مباح کیا، مگر تمہارے ہاتھوں ان کا خون بھی مباح کیا گیا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا خون بھی کسی کے ہاتھوں مباح کیا جائے، تم ان کے تخت کے وارث ہوئے ہو۔ مگر اُن کے جور و طغیان کی وراثت نہ لو۔"

شیخ عبدالعزیز کی بقیہ تقریر

جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا۔ شیخ کا جوش و خروش بڑھتا جاتا تھا۔ سارے دربار پر ایک بیخودانہ ہیبت طاری تھی فوجوں کی قطاریں جس کے ڈرانے کے لئے نکالی گئی تھیں، امراء و رؤسا کا پُر عظمت جلوس جس کی زبان کو گونگا اور عقل کو معطل کر دینا چاہتا تھا۔ خدام و حجاب کی برہنہ تلواریں جس کو سزا دینے اور ایک ادنیٰ اشارۂ شاہی پر قتل کر دینے کے لئے چمک رہی تھیں اور جو ایک فقیر الحال اجنبی اور بیکس مجرم کی طرح بغداد کی کوتوالی میں کھڑا کیا گیا تھا۔ حق کی شہنشاہی کو دیکھو کہ وہی شخص آج مامون، اعظم کے دربار میں اس طرح پادشاہوں کی طرح غضبناک ہو رہا

کر دیتے ہیں۔ تقریر کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا۔

"اے امیرالمومنین خداتعالےٰ نے ہم سے اپنے کلام کی نسبت صرف یہی اقرار چاہا ہے کہ وُہ اللہ کا اُتارا ہوُا کلام ہے۔ جس کو روح الامین نے قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا۔ اور اس کی زبان عربی ہے۔ جیسا کہ فرمایا وانہ لتنزیل رب العلمین نزل بہ الروح الامین علی قلبك لتكون من المنذرین بلسان عربی مبین۔ اس نے کہیں بھی ہم سے اس کا اقرار نہیں کرایا ہے کہ تم قرآن کو مخلوق کہو۔ اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس چیز کو مسلمانوں کے آگے پیش کیا۔ جب کبھی کوئی کافر مسلمان ہوتا تو آپ اُس سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار لیتے، اپنی رسالت پر گواہی دلاتے، اور ارکان اربعہ کی طرف دعوت دیتے، لیکن یہ نہ کہتے کہ قرآن مخلوق تسلیم کرو۔ پھر تمام اصحاب رسُول اللہ کا بھی یہی حال رہا، اور باوجود یکہ ان میں سے بعض بدعتوں اور فتنوں کے آغاز تک موجود تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اُس حد سے باہر قدم نہیں نکالا۔ جو قرآن وسُنّت نے قرار دے دی ہے۔ پس اے امیرالمومنین! تجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ اُمت مرحومہ کے لئے رحمت ہونے کی جگہ عذاب بننا چاہتا ہے؟ اور جب تک کوئی مومن قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کرے۔ تیری تلوار سے نجات نہیں پا سکتا؟ واللہ کہ یہ بدعتوں اور فتنوں کا وہی سیلاب ہے، جس کے اُمنڈنے کی ہم کو خبر دی گئی تھی گمراہوں اور بدعتیوں کا یہ تمام گروہ جو تیرے گرد جمع ہو گیا ہے اور تجھ کو صراط مستقیم سے

فرائض کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور بکثرت قرآن حکیم کی آیات
اور احادیث کی تصریحات بیان کرکے دکھلایا کہ مسلمانوں
کے امیر کو کیسا ہونا چاہئے۔ اور خلفائے عباسیہ علی الخصوص
مامون الرشید نے اعمال کیسے ہیں؟ پھر انہوں نے خلفائے
راشدین اور عامۂ اصحابہ کے اتباع کتاب وسُنت اور
اجتناب بدعات ومحدثات کا حال بیان کیا، اور اپنے شیوخ
حدیث کے سلسلے سے چند حدیثیں روایت کیں، جن میں خلافت
راشدہ کے بعد فتنہ وفساد کے پیدا ہونے کی خبر دی گئی تھی،
اور بتلایا گیا تھا۔ کہ نئے نئے اعتقاد مسلمانوں کے سامنے لائے
جائیں گے۔ اور ان کو کتاب وسُنت کی راہ سے منحرف کرنے
کی کوشش ہوگی۔

شیخ نے اپنے جن شیوخ سے روائتیں کیں، ان میں عبداللہ
ابن نمیر الہمدانی بھی ہیں۔ جو محمد بن عبداللہ ابن نمیر الہمدانی
اُستاد امام بخاری کے والد ہیں۔ نیز عبدالرزاق صنعانی
ہیں۔ جو حضرت امام احمد بن حنبل کے مشہور شیوخ ہیں۔

شیخ نے رسالہ میں اپنی پوری تقریر نقل کی ہے۔ جو پورے
چار صفحوں میں آئی ہے۔ رسالہ کی جو نقل اس وقت پیش نظر
ہے۔ وہ فلسکیپ کاغذ کی تقطیع پر لکھا گیا ہے اور ہر صفحہ
میں ۲۵ سطریں ہیں۔ لیکن بخوف طوالت بقیہ تقریر کو ہم نظر انداز

اے امیر المومنین ایک سُنّت ان لوگوں کی بھی ہے۔ جنہوں نے راہ حجت و برہان میں اپنے کو ناکام پاکر جور و قہر کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اور کہا تھا، حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فعلین۔ ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اس طرح اپنے معبودوں کی حمایت کر۔ جن کے معبود ہونے پر کوئی حجت و دلیل نہیں لاسکتا۔ ان لوگوں کے پاس اپنے اعتقاد کی نصرت کے لئے حجت و دلیل نہ تھی، اس لئے وہ حضرت ابراہیم پر جور و قہر اور ظلم و ستم کرکے اپنے اعتقاد کو منصور و فتح مند کرنا چاہتے تھے، پس اگر دلیل و حجت کی و سنّت کی جگہ قہر و ظلم کی سنّت پر تو عمل کرے گا۔ تو یاد رکھ کہ یہ ملّت ابراہیمی کی سنّت نہ ہوگی۔ ملّت نمرودی کا اتباع ہوگا۔ یا ایں ہمہ پیروان ابراہیم علیہ السلام اس کے لئے بھی تیار ہیں اور تو دیکھ رہا ہے کہ اگر میں اس کے لئے تیار نہ ہوتا۔ تو اس مجلس تک نہ پہنچتا"۔

یاد ہوگا کہ جب عبدالعزیز دربار میں پہنچا تھا۔ تو ایک طرف سے آواز آئی تھی: "اس شخص کے لئے تو صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ قبح اللہ وجھاٰ" خدا کی قسم میں نے کسی شخص کو اس سے زیادہ بدشکل نہیں دیکھا۔" شیخ نے یہ جملہ سنا تھا، مگر اُس وقت خاموشی اختیار کرلی تھی، اب وہ اس طرف متوجہ ہوئے۔

" اور اے امیر المومنین! تو نے کہا ہے کہ میری خواہش مناظرہ کو پورا کرنے کے لئے آج کی مجلس منعقد ہوئی ہے۔ لیکن میں نے دربار میں آتے ہی سب سے پہلی آواز جو سنی، اسی سے معلوم ہوگیا

بھٹکا رہا ہے۔ کیا تیری نظر میں ان کی دلیلوں کی اس سے زیادہ وقعت ہے۔ جو رسول اللہ اور اُن کے اصحاب کو خدا نے دی ہے؟ اگر توحید اور عدل یہی ہے۔ اور خدا کی تمام صفتوں سے انکار کئے بغیر کوئی مومن مومن نہیں ہو سکتا۔ تو کیا وہ سب کے سب مومن نہ تھے۔ جو اگر مومن نہ تھے تو خود ہمارا ایمان بھی باقی نہیں رہتا۔"

اس کے بعد انہوں نے جہم بن صفوان کا ذکر کیا جس نے سب سے پہلے خلق قرآن اور نفی ثبات کی بدعت ایجاد کی اور اپنے اساتذہ کے سلسلۂ روایت سے بیان کیا۔ کہ بعض بقیہ صحابہ نے کس طرح اس قول پر اظہار خشم کیا۔ اور اس کو ایک بہت بڑا فتنہ قرار دے کر مسلمانوں کو اجتناب و احتراز کی وصیت کی۔ پھر کہا:۔

"صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض تھا۔ جس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا، اور الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو حق کا رفیق اور خدام حق کا ولی ہے۔ مجھے تیری مجلس میں پہنچنے اور فرض حق ادا کرنے کی توفیق دے دی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اگر حق ہے تو اس کی تصدیق کر، اور ان مفسدوں کا ساتھ چھوڑ دے۔ جو توحید کے نام سے شرک و ضلالت پھیلا رہے ہیں۔ اگر حق نہیں ہے۔ تو اس کے بطلان پر کتاب و سنت سے دلیل لا، اور مجھ کو جھٹلا تاکہ میں اُس چیز کے حق ہونے کی راہ پا سکوں، جس کو سلف میں سے کسی نے بھی نہ جانا۔ یہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی سنت اور ان کا طریق ہے کہ انہوں نے حجت پیش کی اور منکرین سے حجت طلب کی، لیکن

مامون کی محویت

میں جب تک تقریر کرتا رہا۔ مامون اس طرح ٹکٹکی لگائے میری جانب نگراں تھا، گویا پتھر ہے۔ جس میں نہ تو ارادہ ہے نہ حس۔ اثناء تقریر میں کئی بار میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں تر ہوگئیں تھیں، اور قریب تھا کہ اُن سے آنسو بہ نکلے۔ یہ حال دیکھ کر تمام اہل دربار متحیر تھے۔ اور جب کہ وہ مامون سے حکم قتل کے منتظر تھے، تو انھوں نے دیکھا کہ شدت تاثر و محویت سے وہ خود ہی بے حال ہو رہا ہے۔ ان میں سے ہر شخص حیرت و دہشت سے ہلاک ہوگیا۔ کہ جو مامون مسئلہ خلق قرآن کے لئے قتل و سلب کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا تھا وہ کس طرح صامت و ساکن بیٹھا ہے۔ اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سن رہا ہے؟ حالانکہ وہ اللہ کی نصرت حق سے بے خبر تھے۔ اور نہیں جانتے تھے کہ سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔ اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

مامون کی تقریر

شیخ صاحب جب تقریر ختم کر چکے تو مامون الرشید کچھ دیر تک خاموش رہا، پھر کہا

اے عبدالعزیز! اللہ تجھ پر رحم کرے۔ تونے جو کچھ کہا میں

کہ اس مجلس کے مناظرہ کرنے والوں کے علم و حُجّت کا کیا حال ہے ؛ اور کن دلیلوں سے وہ حق کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں ؛ پھر کیا وہی لوگ مجھ سے مناظرہ کریں گے جن کے پاس سب سے بڑی دلیل بطلان حق کے لئے یہ ہے۔ کہ مجھ کو خالق کائنات نے رنگ اور چہرہ اچھا نہ دیا ؛ اور میں ان کی نگاہوں میں جمیل و حسین نہیں ؛ اے امیرالمومنین! میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ یہ تمام نقش و نگار جو تیرے ایوان دربار کی دیواروں پر بنے ہوئے ہیں۔ اگر خوشنما نہ ہوتے۔ تو تُو ان کو ملامت کرتا یا ان کے صناع اور صناع کے قلم کو ؛ اگر تیری ملامت صناع تک پہنچتی۔ تو کیا میرے جسم و چہرہ پر اعتراض کر کے انہوں نے صناع کائنات پر ملامت نہیں کی اور اس کی صناعت کو ذلیل نہیں ٹھہرایا ؛ کیا ہی توحید ہے، جس کے یہ لوگ مدعی ہیں، اور جو کامل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اللہ کے کلام منزل کو مخلوق نہ کہا جائے ؛ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جمال جسم اور حُسن خلقت عطا فرمایا۔ لیکن پادشاہِ مصر نے جب ان کو قید خانہ سے نکال کر ملک و سلطنت عطا کی تو انہوں نے کہا: "اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم"۔ اے پادشاہ اپنی سلطنت میرے سُپرد کر دے۔ میں حفاظت کرنے والا صاحب علم ہوں۔ یہ نہیں کہا کہ "انی حسن جمیل" مجھے سلطنت دے دے کیوں کہ میں حسین اور خوب صورت ہوں :-

وقد جمعت المخالفين لك لتناظرهم بين يدی، واکون انا الحاکم بینکم، فان تبین الحجة لك علیهم والحق معك اتبعناك، وان تکن الحجة لهم علیك عاقبناك

اور میں نے تیرے مخالفین کو جمع کیا تاکہ تو ان سے میرے سامنے مناظرہ کرے اور میں بمنزلہ ایک حاکم کے تم دونوں فریق کے لئے ہوں (یعنی خود کوئی فریق نہ بنوں) پس مناظرہ کو اگر تیری حجت تیرے مخالفین پر واضح ہوگئی اور حق تیرے ساتھ ثابت ہوا۔ تو ہم تیری پیروی کریں گے، اور اگر تو حجت نہ لاسکا۔ اور حق نے تیرے مخالفین کا ساتھ دیا۔ اور پھر تیرے لئے اس کی سزا ہے۔

آغاز مناظرہ

شیخ نے مناظرہ کے لئے پوری آمادگی ظاہر کی، اور مامون نے بشر مریسی رئیس معتزلہ عہد کو حکم دیا کہ مناظرہ شروع کرو۔

بشر اپنی جگہ سے اٹھ کر مامون کی نشست کے قریب آیا، اس کی تمام جماعت اس کے ساتھ تھی۔ مامون نے خود ہی فیصلہ کر دیا تھا کہ دلیل بشر پیش کرے گا۔ اور شیخ جواب دے گا۔ خارج از موضوع کوئی بات نہیں کی جائے گی۔ دلائل کا تمام دار و مدار صرف قرآن کی اندرونی شہادت پر ہوگا۔ اور ہر فریق پورے ضبط و سکون اور کشادہ دلی کے ساتھ مخالف کی تقریر سنے گا۔ مامون نے دونوں فریق کو مخاطب کر کے

نے سنا، اور جن جن چیزوں کو تو نے میری طرف نسبت دی، ان کے لئے میں نے اپنے نفس کا احتساب کیا۔ الحمد للہ کہ میں ان سے بری ہوں۔ میں بندگان خدا پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ ان کو حق اور توحید کی طرف بلاتا ہوں جس کو دلیل و برہان اور کتاب اللہ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے۔ بایں ہمہ یقین کر کہ میرا حلم میرے غضب پر غالب آئے گا۔ اور خدا کی قسم، میں تیری اور سختی اور درشتی کی وجہ سے اپنا انتقام تجھ سے نہ لوں گا، بلکہ تیری دلیلوں کو سنوں گا۔ اور تیرے براہین کو وزن کروں گا۔ مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ تو حق کی غیرت رکھتا ہے اور اس کے لئے بے باک ہے۔ تو نے اپنے گھر کو دنیا کے لئے نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس چیز کے لئے چھوڑا جس کو تو حق یقین کرتا ہے پس تیری حمیت حق اس کی مستحق ہے۔ کہ تیری عزت کی جائے۔ اور تیری کوئی سختی مجھ کو اس اعتراف سے نہیں روک سکتی۔ میرا تیرا معاملہ اب صرف حق باطل کا ہے۔ اگر تیرے پاس حجت ابراہیمی ہے۔ تو پیش کر جس کی پیروی کے لئے تو یہاں تک آیا ہے، اور جب تک تو قرآن کی اس شہادت اور عقل صریح کی اس دلیل کو نہ جھٹلا دے۔ جو قرآن کو مخلوق ثابت کرتی ہے۔ اس وقت تجھے حق نہیں ہے کہ اپنے آپ کو حجت ابراہیمی کا پیرو ثابت کرے، حجت ابراہیمی یہ تھی کہ جب منکر خدا نے اُس سے جھگڑا کیا، تو حضرت ابراہیم نے کہا "اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تجھ کو اس سے انکار ہے تو مغرب سے نکال دیکھ۔" یہ حجت ایسی تھی جس کو عقل نے پہچانا اور مشاہدہ و حس نے اس پر گواہی دی، پس تو بھی حجت لا۔ اور صاحبان علم و حجج سے مناظرہ کر۔"

اسی سلسلہ میں حروف و اصوات کی بحث نکل آئی۔ جہم بن صفوان نے اگرچہ نفی صفات کی بنا پر خلق قرآن کا دعویٰ کیا تھا۔

لیکن بشر مریسی کا اعتقاد اشاعرہ کے اعتقاد سے اقرب تھا، وہ زیادہ تر حروف و اصوات عربیہ کے حدوث و خلق پر زور دیتا اور "کلام اللہ" "وہ قرآن عربی" میں تفریق کر کے اس قرآن کے خلق وحدوث کو قطعی قرار دیتا جو عربی زبان میں ہم پڑھتے اور سمجھتے ہیں لیکن شیخ عبدالعزیز نے ثابت کیا کہ جو قرآن اتارا گیا وہ عربی میں تھا۔ جیسا کہ جابجا فرمایا انا انزلناہ قرآنا عربیا یا کہا بلسان عربی مبین یعنی وہ چیز جو عربی زبان میں اتری تھی اگر عربی تھی تو قطعاً عربی کے حروف و اصوات ہی بلیغ تھی۔ ان سے مجرد نہیں ہو سکتی۔ اور وہی کلام اللہ ہے۔ پس کلام اللہ عربی میں اترا، اسی کو رسول نے تلاوت کیا، اور وہی ہماری زبانوں سے بھی نکلتا ہے۔ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

فتح و شکست کا آخری میدان

سلسلہ بحث بڑھتا جاتا تھا اور سامعوں کا یہ حال تھا۔ کہ کبھی شیخ کے حسن و جواب کی داد دیتا۔ اور کبھی بشر کے استدلال و استشہاد سے خوش ہوتا۔ کہ یکایک بشر نے کہا:۔

" میں اپنے اور تمام دلائل و براہین کو خود ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ اس طرح رد و کد میں کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اب صرف ایک سوال کرتا ہوں اس کا جواب دو۔ تمام بحث کا ابھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور حق کے انکشاف

اس بارہ میں جو تقریر کی، وہ نہایت دقیع ہے اور گویا آداب مناظرہ پر ایک بہترین درس ہے۔ جس قدر حصہ شیخ نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے۔ ہم کسی دوسری صحبت میں اس کا ترجمہ کریں گے۔

اب مناظرہ شروع ہوا۔ بشر یکے بعد دیگرے قرآن کریم کی آیت پیش کرتا۔ اور شیخ اس کا جواب دیتے۔ پھر رد و جواب الجواب کا سلسلہ جاری ہوتا۔ شیخ نے حرف بحرف تمام مناظرہ نقل کیا ہے اور پوری شرح وبسط اور انصاف و عدالت کے ساتھ مخالف کی تمام دلیلوں اور تقریروں کو قلم بند کیا ہے۔

افسوس کہ ہم اس مناظرہ کو نقل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بہت طول طویل ہے اور رسالہ کے اوراق کا بڑا حصہ اسی پر مشتمل ہے۔ نیز زیادہ تر خالص علمی دلائل ومباحث سے تعلق رکھتا ہے جس کے مطالعہ میں عام قارئین رسالہ کے لئے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ عموماً جو دلائل کتب کلام و عقائد واختلاف میں مسئلہ قدم و خلق قرآن کے متعلق نظر آتے ہیں۔ وہی فریقین کی طرف سے پیش ہوئے اور موجودہ صحبت کا موضوع مسئلہ خلق قرآن نہیں بلکہ علمائے سلف کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک نظارہ دکھانا ہے۔

بشر مریسی کی طرف سے جس قدر آیتیں قرآن حکیم کی پیش کی جاتی تھیں۔ اس کے جواب میں خود قرآن ہی سے عبدالعزیز استشہاد لاتے۔ اور ثابت کر دیتے کہ ان آیات کو خلق قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔

شیخ عبدالعزیز لکھتے ہیں۔ کہ خود بشر بھی اپنا جوش و تعصب نہ روک سکا اور بار بار کہنے لگا: "ولکن قعد حمارا لشیخ علی القنطرة۔" یعنی بالآخر شیخ کا گدھا پل دیکھ کر بیٹھ گیا۔ اور آگے نہ بڑھ سکا۔

شیخ کا اعراض دیکھ کر مجلس کو یقین ہو گیا۔ کہ شیخ کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہیں۔ اور اس نے تلوار رکھدی۔ اگر وہ تسلیم کرتا ہے۔ کہ قرآن بھی شئے ہے۔ اور اشیاء میں داخل ہے۔ تو لازمی طور پر ماننا پڑتا ہے۔ کہ اللہ ہر شئے کا خالق ہے۔ اور ہر شئے مخلوق ہے۔ پس قرآن بھی مخلوق ہے۔ اگر نہیں مانتا تو عقل و ہدایت سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے یہ کسی طرح نہیں کہہ سکتے کہ وہ شئے نہیں۔ اگر شئے نہیں تو کیا ہے؟

خود مامون الرشید کا بھی یہی خیال تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ شیخ عبدالعزیز بالکل بے بس ہو گیا ہے۔ اسی لئے جواب سے بچنا چاہتا ہے۔ اس نے پہلی دفعہ غضب ناک ہو کر شیخ سے کہا:

"یا عبدالعزیز! تجھے کیا ہو گیا ہے، کیوں سوال کا جواب نہیں دیتا۔"

اعلان حق

شیخ لکھتے ہیں، کہ فی الحقیقت اس وقت میں کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا اور صاف نظر آتا تھا۔ کہ قرآن کے "شئے" ماننے کے ساتھ ہی یہ سب لوگ شور مچائیں گے۔ کہ قرآن کا مخلوق ہونا ثابت ہو گیا۔ لیکن مامون کے غضب ناک ہوتے ہی اللہ نے میری مدد کی۔ اور یکایک راہ کامیابی دکھلادی۔"

کے بغیر تم کوئی راہ نجات اپنے سامنے نہ پاؤ گے۔"
یہ کہہ کر اس نے سوال کیا:۔
" قرآن نے صدہا مقام پر اللہ کو خالق کل شئ کہا ہے یا نہیں۔ یعنی خدا ہر چیز کا خالق ہے؟"
شیخ نے کہا:۔ ہاں وہی ہر شئے کا خالق ہے۔"
بشر نے کہا:" قرآن بھی شئے ہے یا نہیں؟"
شیخ نے کہا:۔ پہلے "شئے" کی حقیقت سن لو۔ پھر جواب مانگو"
بشر زیادہ تیز ہو کر بولا۔ میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا، میرے سوال کا جواب دو۔ قرآن بھی "اشیاء" میں داخل ہے یا نہیں؟"
شیخ نے پھر کہا:۔ تمہارا طرز سوال ہی غلط ہے۔ اس میں دھوکا ہے تم کو چاہئے کہ صبر وضبط کے ساتھ پہلے میری تقریر سن لو۔"
بشر نے کہا:" تقریریں بہت ہو چکیں، امیر المومنین کو نتیجۂ مناظرہ کا انتظار ہے۔ اب اور کسی تقریر کی ضرورت نہیں۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔"
شیخ نے پھر جواب سے اعراض کیا۔ اس پر بشر نے مامون سے کہا
" یا امیر المومنین! حاکم کا فرض عدل وانصاف ہے۔ آپ حاکم ہیں۔ اگر عبدالعزیز حجت رکھتا ہے۔ تو سوال کا جواب کیوں نہیں دیتا؟"
یہ حالت دیکھ کر محمد بن جہم معتزلی نے پکارا:۔ ظھر امر اللہ و ھم کارھون۔" بشر کے گروہ میں سے ایک شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور چیخ کر کہا " یا امیر المومنین جاء الحق و زھق الباطل۔ ان الباطل کان ذھوقا۔"

خلق قرآن کے اعتراف پر مجبور سمجھتا تھا۔ یا بے اختیار ہو کر عبدالعزیز کے جواب پر وجد کرنے لگا اور پکار پکار کر کہنے لگا " معاذ اللہ! معاذ اللہ! خدا کی ذات موت سے بری ہے۔

خاتمہ

بشر مریسی نے اپنے آخری سوال کو مناظرہ کا خاتمہ قرار دیا تھا۔ شیخ نے بھی اس کا جواب ایسا ہی دیا۔ وہ مناظرہ کا خاتمہ اور حجت کا علاج آخری تھا۔

مامون الرشید نے حکم دیا کہ مناظرہ ختم کیا جائے۔ اور عبدالعزیز سے مخاطب ہو کر کہا

" اگرچہ اس مسئلہ کا فیصلہ ہماری آج کی صحبت میں نہ ہو سکا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تو نے اپنے مخاطب کا میابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور اس کی کسی دلیل کے آگے میں نے تجھے عاجز نہ پایا۔ تیری فضیلت علمی پر تیرے جوابات گواہ ہیں تیری جرأت و ذہانت قوی تیری فضیلت کا اصلی جوہر ہے۔ تو نے جس بے خوفی و بے جگری سے میرے حضور میں زبان کھولی اور جس طرح میرے جلال و غضب اور سطوت و جلالت کے خوف سے بے پروا ہو کر تقریر کی۔ واللہ کہ میں اس کی قدر کروں گا۔ اور تیری شستگی زبان کو اپنی قدردانیوں اور حلم سے تھکا دوں گا۔ میری طرف سے تیرے لیے اس اور اعزاز کا فرمان ہے اور تیرا جوہر استعداد اس کا مستحق ہے کہ میری مجلس علم کا ندیم ہو۔ تو بے مدینۃ السلام میں قیام کر۔ اور ہر جمعہ کے دن میری صحبت علمی میں شریک ہو۔

شیخ نے کہا، مجھ کو جواب دینے سے انکار نہیں لیکن جس طریق سے سوال کیا گیا ہے۔ اس میں ایک سخت دھوکا اور فساد ہے اس لئے میں پہلے اُسے صاف کرنا چاہتا تھا۔ با ایں ہمہ اگر امیرالمومنین کو اس پر اصرار ہے تو اچھا، میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے۔"

یہ اقرار سنتے ہی بشر اچھل پڑا، اور بشر اور مامون الرشید ایک ساتھ بول اُٹھے :-

" اگر قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے۔ تو قرآن کہتا ہے۔ کہ اللہ تمام اشیاء کا خالق ہے۔ اور تمام اشیاء مخلوق ہیں۔ پس قرآن کو بھی تم نے مخلوق تسلیم کر لیا۔"

شیخ نے گرج کہا :-

" ہرگز نہیں! اس سے یہ کبھی لازم نہیں آتا۔ قرآن کہتا ہے۔ ویحذرکم اللہ نفسہ یعنی اللہ تم کو اپنے "نفس" سے ڈراتا ہے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا بھی نفس ہے۔ اور پھر قرآن کہتا ہے کہ کل نفس ذائقۃ الموت ہر نفس کے لئے ضرور ہے کہ وہ موت کا مزہ چکھے۔ پس اگر اشیاء میں قرآن ہو کر مخلوق ہو گیا۔ تو کیا خدا بھی "کل نفس" میں داخل ہو کر اور نفس ہو کر موت کا مزہ چکھے گا؟"

شیخ عبدالعزیز کا یہ کہنا تھا۔ کہ تمام مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا یہ الفاظ نہیں تھے، ایک بجلی تھی جو یکایک کوند گئی۔ اور تمام نگاہوں کو خیرہ اور دلوں کو دہلا گئی۔ خود بشر مریسی مبہوت ہو کر دیکھنے کا دیکھتا رہ گیا!

فوقع الحق وبطل ما کانوا یعملون۔

یا تو مامون الرشید غضبناک ہو کر شیخ سے جواب طلب کر رہا تھا اور اسے

حاصل کر سکتا ہے۔"

صبح سے لے کر شام تک میرا مکان لوگوں سے بھرا رہتا۔ اور مجلس مناظرہ کے حالات پوچھتے۔ میں روایت کرتے کرتے تھک گیا۔ یہاں تک کہ خبر دُور دُور پھیل گئی۔ اور حجاز و شام تک سے لوگ دریافت کرنے کے لئے آنے لگے۔ تب عاجز آ کر میں نے چاہا کہ اس مناظرہ کے واقعات قلم بند کر دوں۔ تاکہ ہر شخص اس کو پڑھ کر حق کی فتح اور باطل کے خذلان کی سرگذشت معلوم کر لے۔"

استدراک

(۱) شیخ نے اپنی تقریر کے ابتدائی حصہ میں کہا ہے

"خدا نے مسلمانوں سے خلق قرآن کا اقرار نہیں کرایا۔ لیکن ایک انسان کرانا ہے (یعنی مامون) جو ہارون کے گھر میں پیدا ہوا اور ہارون ہادی کا بیٹا تھا۔"

شیخ کے رسالہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا نہیں ہے بلکہ ہارون اور ہادی دونوں محمد بن منصور ملقب بہ مہدی کے بیٹے ہیں۔ مہدی کے بعد تیرہ ماہ تک ہادی تخت نشین رہا۔ اس کے بعد ہارون الرشید خلیفہ ہوا۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔

(۲) تقریر میں انھوں نے کہا۔ "تم سے پہلے آئمہ جور نے جو کچھ کیا، اللہ نے اس کے لئے تم کو کھڑا کر دیا۔" یہ اشارہ بنو امیہ کی طرف تھا۔ جن کو ہلاک کر کے آل عباس نے اپنی حکومت قائم کی۔

(۳) اس سرگذشت کو ہم نے نہایت تفصیل سے لکھا۔ تاکہ ہمارے موجودہ عہد کے

شیخ لکھتے ہیں: "اس کے بعد مامون الرشید نے حکم دیا کہ دس ہزار درہم میری قیام گاہ پر بھیج دیا جائے۔ نیز قیام کے لیئے ایک سجا سجایا محل سرکاری بھی مرحمت ہو۔ پھر تلوار کے نیام پر ہاتھ رکھا۔ جو مجلس کی برخاستگی کا اشارہ تھا۔ تمام اہل دربار اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جب رخصت ہونے لگا۔ تو مامون مسکرایا اور کہا:" آج تونے اپنے بڑے ہی طاقتور حریف پر فتح پائی ہے"

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

" میں جب دربار سے نکلا۔ تو تمام لوگوں کو راستوں، دکانوں اور کوٹھوں پر چشم براہ پایا۔ لوگ منتظر تھے، کہ میری اس جرأت کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ جب انھوں نے دیکھا کہ میں نہایت اعزاز و کرام کے ساتھ واپس جا رہا ہوں۔ اور مجلس مناظرہ میں کامیاب رہا ہوں۔ تو ان کی مسرت اور خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ لوگ ہر طرف سے مبارکباد دینے اور ارباب حق کی فتح پر خوشیاں منانے کے لئے ہجوم کرتے۔ اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے واسطے اپنی جانوں کو ٹھلکہ میں ڈالتے حتیٰ کہ جوش خلائق اور شدت ہجوم سے میں عاجز آگیا اور گھر تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔"

اس کے بعد جب تمام علماء شہر و امصار کو واقعات مناظرہ کی خبر ملی تو اس غیر متوقع تائید غیبی پر سجدۂ شکر بجالائے اور اس ایک نمونہ نے ہزاروں زبانوں کو یکایک کھول دیا۔ جو خوف جان و مال سے اظہار حق نہیں کرسکتی تھیں۔ پہلے مامون کے غضب و صولت کو دیکھ کر کسی کو جرأت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن اب لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ کہ اگر جرأت و ثابت قدمی کے ساتھ حق کا اعلان کیا جائے۔ تو اللہ کی نصرت کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی اور ہر شخص کامیابی

الحرّیۃ فی الاسلام

یعنی

نظامِ حکومت اسلامیہ

تمام دنیا میں جمہوریت کے خیالات پھیل رہے ہیں، شخصی استبداد و مطلق الحکمی سے ہر جگہ نفرت کی جا رہی ہے۔ اور اس حقیقت کا اعتراف ہو چکا ہے کہ قانونی و سیاسی آزادی میں تمام انسان مساوی الرتبہ ہیں۔ قوم کو اپنے ثمراتِ ملک سے تمتع کا حق حاصل ہے۔ وہ اس حق میں دوسروں پر مقدم ہے دنیا کی تمام قومیں اس حقیقت پر ایمان لا چکی ہیں۔ اور ہر ممکن ذریعہ و کوشش سے اس کے حصول کے لئے کوشاں ہیں بعض کوششیں ہدفِ مقصود تک پہنچ چکی ہیں اور بعض پہنچنے کے قریب ہیں۔

لیکن مسلمان جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ اب تک اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور جو باخبر ہیں ان کے تصور میں اس کی صورت عجیب ہے۔ حالانکہ اس حق طلب اور داد خواہ جماعت میں سب کے آگے مسلمانوں کو ہونا چاہیے تھا، کیونکہ ان کا پیغمبر دنیا میں صرف اسی لئے آیا۔ تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلائے۔

یورپ کی قومیں دور سے کھڑی مسلمانوں کے اعمال و حرکات جبل عن الحقیقۃ کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ ہم کو از راہِ لطف و کرم اس راستے کے شدائد و خطرات

علماء سلف کے ان واقعات کو پڑھیں اور عبرت پکڑیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت و تبلیغ حق ہی وہ اعلیٰ و حقیقی فرض ہے۔ جو اسلام نے علماء کے سپرد کیا اگر اس فرض سے ان کو علم و عمل خالی ہے۔ تو ان کو یقین کرنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی ہستی مٹادی، اور راستے کے پتھر اور جنگل کی گھاس ان سے زیادہ قیمتی ہے ۔

مقصور رہا۔ جس کا تخیل بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے کارنامہ ہائے سیاسیہ اور طرق اصلاحِ حکومت دنیویہ سے آج واقفیت حاصل کرے۔

آج سے ۱۳۳۱ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ کہ دُنیا استبداد و استعباد کے عذاب الیم میں مبتلا تھی۔ غلامی کی زنجیروں نے اس کا بند بند جکڑ رکھا تھا۔ فرمانروایانِ ملک، امرائے شہر، روسائے قبائل اپنے اپنے حلقۂ فرمانروائی میں "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللہ" تھے، اور ان کے ہاتھ میں ان کے اطاعت گزار اور پیرو بالکل مثل معدوم الارادت آلات عمل کے تھے۔ جن کی زندگی کا موضوع واحد صرف اپنے قادر قابض کی نکیلیں ہوائے نفس و اتباع مرضیات تھا۔ صداقتِ یقین کی حقیقت اور امور و واقعات کی صداقت کا فیصلہ سلاطین و امرا کے چشم و ابرو کا ایک اشارہ اور ملوک و روساء کے کام و دہن کی ایک جنبش کرتی تھی۔ مسیح سے سترہ سو برس پہلے ذات شاہی ہر تقدیس سے متصف، ہر احترام فوق العادت سے مقدس اور ہر نقص و عیب سے مبرّا تھی۔ کیونکہ وہ خدا تھی خدا کا سایہ تھی یا کم از کم مرتبۂ انسانیت سے ایک بالاتر شئے تھی۔

فراعنۂ مصر دیوتا تھے۔ اسی لئے مصر کے ایک فرعون نے مسیح سے سترہ سو برس پہلے اپنے درباریوں کو کہا تھا "انا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ"۔ یعنی موسیٰ کا خدا کون ہے؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں۔" کلدانیوں کے ملک میں نمرود بابل کی پرستش کے لئے ہیکل بنتے تھے۔ ہندوستان کے راجہ دیوتاؤں کے اوتار بن کر زمین پر اُترتے تھے۔ روما کا پوپ خدا کے فرزند کا جانشین تھا۔ اور

سے مطلع کیا جاتا ہے۔ اور وعید و تہدید کی کڑک میں یہ تنبیہ کرنے والی آواز سنائی دیتی ہے کہ دیکھنا اس زنجیر کو جس سختی سے کاٹنا چاہو گے۔ اسی سختی سے پاؤں میں اور زیادہ لپٹ جائے گی" اکثر واعظین سیاست ازراہ شفقت و نصیحت ہم کو یہ بھی تلقین کرتے ہیں۔ کہ حریت حکومت کے لئے اس قسم کی کوششیں اور جدوجہد تعلیمات قرآنیہ کے خلاف اور تاریخ اسلام کی منافی ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ واقعات تازہ نے مسلمانوں کے حسیات زندہ کر دیئے ہیں۔ ان کو اپنا از یاد رفتہ خواب پھر یاد آگیا ہے۔ اتباع احکام ربانی کے لیۓ ان میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا ہے، اور اسلام کی حریت و آزادی کے اسباق پر انھوں نے نظر ڈالنی شروع کر دی ہے۔ اس لیۓ ان کے ناصحین و مشفقین سیاست کو ان کی ہدایت سے مایوس ہو جانا چاہئے کہ ان کا اب گمراہ ہی ہو جانا ان کے حق میں ہدایت سے بہتر ہے وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

نوبت زہد فروشان و ریاکار گزشت
وقت شادی و طرب کردن رندان برخاست

اسلام خود اپنے بیان کے مطابق رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً دین و دنیا کی اصلاح کے لئے آیا تھا۔ اور اس لیۓ دونوں جہاں کی برکات اس کے ساتھ تھیں۔ پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام کے خزانۂ ہدایت میں حسنات سیاست دنیاوی کا وجود نہیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ منصف خدمت انسانی کی انجام دہی کر

صومعوں اور خانقاہوں میں پڑی سوتی تھی، عسکر حجاز کی آوازوں سے چونک پڑی اور اسلام کی اس نئی سوسائٹی کا ہر ممبر حسب استعداد و فطرت و حوصلہ اپنے اپنے مرتبہ پر پہنچ گیا۔

یہ معجزانہ قوت و توانائی کیا تھی؟ جلال روحانی سے بھری ہوئی ایک آواز تھی جو قبیس کی پہاڑی سے بلند ہوئی۔ اور جس سے گنبد عالم کا گوشہ گوشہ گونج اُٹھا، کہ اے اہل عالم!

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۳ : ۵۷)

آؤ ایک بات جو اصولاً و عقلاً ہم میں تم میں متفق علیہ ہے۔ اس کو عملاً بھی تسلیم کرلیں۔ یعنی خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں۔ نہ اس کی خدائی میں کسی کو شریک ٹھہرائیں اور ہم خدا کے سوا ایک دوسرے کو اپنا خدا اور آقا بنائیں۔

اس ایک آواز سے انسانی جباری نالوہیت کے بت سرنگوں ہو کر گر پڑے شہنشاہیوں کا پُراسرار اور عجیب الخواص طلسم ٹوٹ گیا۔ پادشاہ، خادم، رعایا، بیت المال، خزینۂ عمومی اور تمام انسان مساوی الرتبہ قرار پاگئے۔ عرب کے بادشاہ نے اپنے لئے قصر و ایوان تیار کرایا نہ قاقم و دیبا کے فرش بچھائے، نہ سونے چاندی کی کرسیوں سے دربار سجایا اور نہ اُس نے اپنی ہستی کو انسانیت سے مافوق بتایا۔ بلکہ علی الاعلان کہہ دیا کہ

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ — میں بھی تمھاری ہی طرح ایک آدمی ہوں

اور اس کا آستانۂ خدمت سجدہ گاہ ملوک و سلاطین۔

روم کے قیصر اور فارس کے کسریٰ گو دیوتا نہ تھے۔ لیکن فطرتِ بشریہ کی منزہ، اور مرتبۂ انسانیت سے بلند تر ہستی تھے۔ جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع جن کے سامنے ابتدائے کلام گناہ، جن کا نام لینا سوء ادب اور جن کی شان میں ادنیٰ سا اعتراض بھی موجب قتل تھا۔ بیت المال ملکی سلطان مصرف رعایا ملک غلامان درگہ شہنشاہی تھے۔

دنیا اسی تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر میں تھی کہ بحر احمر کے سواحل پر ریگستانی سرزمین میں "ایک عربی بادشاہ کا ظہور ہوا۔ جس نے سچے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے۔ روحِ ملکی کے ایوانِ قدس کی بنیادیں ہلا دیں۔ تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیرِ غیر آہنی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ اور استقلال ذات و فکر، حریت، خیال و رائے و شرف و احترامِ نفس، مساوات حقوق، اور ابطال شاہنشہی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئی۔ شاہانِ عالم مرتبۂ قدوسیت و معصومیت سے گر کر عام سطحِ انسانی پر آ گئے۔ اور عام انسان سطحِ غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔ اور بقول گبن (مشہور مورخ) قولِ عمل و زندہ دلی جو

لہ ملک عرب دنیائے قدیم کے قلب میں واقع ہے۔ جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے اور جغرافیہ جدیدہ سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

موضوعۃ وان اول دم اضعہ من دمائنا دم ابن ربیعہ الحارث	خونریزی اور اس کے انتقام کے تمام واقعات آج سے فراموش ہوں۔ سب سے پہلے میں خود اپنے عم زاد بھائی ابن
(الحدیث صحاح)	ربیعہ بن حارث کا خون فراموش کرتا ہوں۔

یہ ایک آواز تھی جس سے عرب کی پُر شور و شر فضا میں سکوت طاری ہوگیا۔ امن عام کا پرچم لہرا گیا۔ حکومت الٰہی کے اس داعی نے نصرانی شہزادہ عدی سے فرمایا تھا کہ عرب کی بے اطمینانی سے نہ گھبراؤ۔ وہ وقت آئے گا کہ ایک بڑھیا سونا اچھالتی ہوئی عرب کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں نکل جائے گی اور کوئی اس سے تعرض نہ کرے گا۔" پس وہ وقت آگیا کہ بڑھیا سونا اچھالتی ہوئی ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں نکل گئی اور کسی نے اس سے تعرض نہ کیا۔

تاسیس اصلاحات حکومت اس سلسلہ میں یہ عجیب بات ہے کہ اسلام نے حکومت اسلامی کا جو نظام قرار دیا وہ ایک ایسی چیز تھی جو اس کے گردوپیش کے نظامات حکومت میں کہیں بھی موجود نہ تھی۔ اس نے ایک باقاعدہ قانونی و جمہوری حکومت کی بنا ڈالی۔ حقوق عامہ کی تشریح و تعیین کی۔ تعزیرات و حدود جرائم کے منابط قائم کیے۔ عدل و انصاف کی تعلیم دی۔ قانونی نسائح و اختشار شخصی کی ممانعت کی۔ شخصی حکومت و ذاتی امتیاز کو ایک قلم مٹا دیا۔

یہ مجمل بیانات ہیں جن کی تفصیل و اثبات کے لئے موجودہ

یہ تو عرب سے باہر کا حال تھا۔ خود عرب کا حال کیا تھا؟ اطراف میں یمن یمامہ غسان، حیرہ، بحرین، عمان میں روم اور فارس کے ماتحت جو ریاستیں تھیں۔ وہ سرتاپا روم و ایران کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں، لیکن وسط عرب کی بھی حالت یہ تھی کہ اسلام سے پہلے وہ بالکل مبتلائے نوضویت تھا۔ جس طرح قبیلے قبیلے کا خدا الگ تھا۔ اسی طرح ہر قبیلے کا شیخ بھی الگ تھا۔ آپس کی جنگ و جدال اور حرب و قتال نے تمام ملک کو کارزار بنا رکھا تھا۔ بے امنی و بے اطمینانی عرب کے گوشے گوشے میں موجود تھی۔ قبائل کا ایک دوسرے کے تملوکات پر غارت گری بہترین کسب معاش تھی۔ اس پر شعرائے قبائل فخریہ قصائد لکھتے تھے۔ اور ہر شخص دوسرے کی عزت و مال کو اپنے لئے بہترین قرار دیتا تھا۔

غرض کہ دنیا کے اس خشک و بے آب ملک کا چپہ چپہ انسانوں کے خون سے سیراب کیا جا رہا تھا۔ کہ دفعۃً سلطنت الٰہی کا ظہور ہوا۔ اور وادیٔ مکہ میں عرب کے سب سے بڑے مجمع کے اندر اس کے اس فرمان کا اعلان کیا گیا کہ اے اولاد آدم!

الا ان دماءکم و اولادکم	ہوشیار ہو جاؤ کہ آج جان اور مال کی حرمت
حرمت علیکم کحرمۃ یومکم	قائم کی جاتی ہے۔ جس طرح آج کے روز
ھذا فی شہرکم ھذا	کی اس شہر مکہ میں اور ماہ
فی بلدکم ھذا الا کل	حج میں حرمت ہے۔ ہوشیار ہو کہ
شئی من امر الجاھلیۃ تحت	جاہلیت کی تمام باتیں آج میرے پاؤں
قدمی موضوع ودماء الجاھلیۃ	کے نیچے ہیں۔ ایام جاہلیت کی

جمہور کی ملک ہے۔ اور کسی خاص شخص کی ذاتی یا خاندانی ملک نہیں۔ بہترین دلیل خود اسی کی زبان ہے۔ قرآن مجید کا یہ حکم ہر شخص کو معلوم ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳، ۱۵) — امور حکومت میں اے نبی! مسلمانوں سے مشورہ لے لیا کرو۔

دوسری جگہ حکومت اسلامیہ کی مدح میں ارشاد فرمایا۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲: ۳۶) — ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت میں حکومت کے لئے مشورۂ عام کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت میں اس حکم کی تعمیل کی تصدیق کی گئی۔

ان دونوں آیتوں سے چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱ ۔ حکومت اسلامیہ میں مشورۂ عام شرط ہے۔

۲ ۔ حکومت کی اضافت عام مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے جس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حکومت اسلامیہ کسی کی ذاتی ملک نہیں۔ بلکہ جمہور اسلام کی ملک ہے۔

۳ ۔ تیسری بات اُن سے یہ ثابت ہوتی ہے۔ کہ مسلمانوں کا صدر اول میں اسی پر عمل تھا۔ کیونکہ بغیر تاریخ سے مدد لئے ہوئے خود قرآن ہم کو بتلاتا ہے۔ کہ ان کی حکومت باہمی مشورے سے ہے۔

قرآن مجید کی ان آیات میں ہم کو اپنے دعوےٰ کے اثبات کے لئے کسی دوسری دلیل کی احتیاج نہیں۔ لیکن واقعات کے سلسلۂ ترتیب

اصول جمہوریت و عمومیت کی بنا پر متعدد مباحث طے کرنے چاہئیں۔

ایک بہتر سے بہتر حکومت کے تخیل کے لوازم

نظام جمہوریت:۔ کیا ہیں۔ اس کے جواب میں ہمارا موجودہ سیاسی لٹریچر ان دفعات سے بہتر کوئی شے نہیں پیش کر سکتا۔ جو انقلاب فرانس کے شدائد و مصائب کے بعد اٹھارہویں صدی میں مرتب ہوئے، اور جن پر آج جمہوری حکومتوں کا عمل ہے۔یعنی۔

۱۔ حکومت جمہور کی ملک ہے۔ وہ ذاتی یا خاندانی ملک نہیں۔

۲۔ تمام اہل ملک ہر قسم کے حقوق و قانون میں مساوی ہیں۔

۳۔ رئیس ملک (پریذیڈنٹ) جس کو اسلام کی اصطلاح میں امام یا خلیفہ کہتے ہیں۔ اس کا تقرر ملک کے انتخاب و اختیار عام سے ہو۔ اور اس کو دیگر باشندگان ملک پر کوئی ترجیح نہ ہو۔

۴۔ تمام معاملات ملکی اور امور انتظامی و قانونی ملک کے اہل الرائے اشخاص کے مشورہ سے انجام پائیں۔

۵۔ بیت المال یا خزانہ ملکی عام ملک کی ملکیت ہو۔ رئیس کو بغیر مشورہ ملک و اہل حل و عقد کے اس پر تصرف کا کوئی حق نہ ہو۔

حکومت جمہور کی ملک ہے، وہ ذاتی یا خاندانی ملک نہیں یہ بحث درحقیقت زبدۂ مباحث و خلاصۂ جمہوریت ہے اور آئندہ کی تمام بحثیں درحقیقت اسی اصل کی فروع اور متعلقات ہیں۔ اس دعوے کے اثبات کے لئے کہ "اسلام میں حکومت

آقا اور غلام، معزز اور حقیر، چھوٹا اور بڑا، امیر اور فقیر سب برابر ہیں صہیب و بلال جو آزاد شدہ غلام تھے۔ سرداران قریش کے پہلو بہ پہلو کام کرتے ہیں۔ اسلام کے سامنے صرف ایک ہی چیز ہے جس سے انسانوں کے باہمی رتبے میں تفریق ہو سکتی ہے یعنی تقوےٰ اور حسن عمل۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹، ۱۳)	تم میں زیادہ معزز وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔

رسول اللہ صلعم نے صرف ایک فقرے میں مراتب کی تفریق کر دی۔

الکرم التقوی (ترمذی باب مفاخرت)	بزرگی اور بڑائی صرف تقوی و حسن عمل ہے۔
لیس لاحد علی احد فضل الا بدین و تقوی (مشکوٰۃ باب مفاخرت)	ایک کو دوسرے پر فضیلت دینی اور تقوی کے سوا اور کوئی حق ترجیح و فضیلت نہیں ہے
الناس کلهم بنوا آدم و آدم من تراب (مشکوٰۃ)	تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنا تھا۔ پس سب آپس میں برابر ہیں۔

مساوات قانونی کی اصلی تصویر صرف اسلام کے مرقع ہی میں مل سکتی ہے قانون اسلام کی نگاہ میں حاکم و محکوم اور امام و عامۂ ناس یکساں ہیں۔ کیا اسلام سے پہلے یہ ممکن تھا کہ بادشاہ اپنی رعایا کے مقابلہ میں ایک معمولی آدمی کی طرح عدالت میں حاضر ہو؟ حضرت عمر اور ابی ابن کعب میں ایک معاملہ کی نسبت نزاع

اور اعدائے اسلام کی تبکیت کے لیے ہم کو چند دیگر واقعات کا بھی اضافہ کرنا ہے جس سے اس کا عملی رخ اور زیادہ واضح ہو جائے۔

(۱) آنحضرت صلعم نے اور خلفائے راشدین نے اپنا جانشین کسی عزیز یا اپنے بیٹے کو نہیں بنایا۔

(۲) تمام معاملات ضروری میں آنحضرت اور خلفائے راشدین مہاجرین انصار سے خصوصاً اور عام مسلمانوں سے عموماً مشورہ لیتے تھے۔

(۳) خلفار کا تقرر عموماً مشورۂ عام سے ہوتا تھا۔

(۴) بیت المال عام مسلمانوں کا حق تھا۔ کبھی ذاتی طور پر اس کو صرف میں نہیں لایا گیا۔ اور اسی لیے اس کا نام "بیت المال المسلمین" تھا۔ حالانکہ اگر اسلام شخصی حکومت کی بنیاد رکھتا تو ضرور تھا کہ امور مذکورہ بالکلیہ حکومت اسلامیہ میں مفقود ہوتے۔

الغرض آیاتِ مذکورہ کے علاوہ خلفار کا عام مجمع میں انتخاب آزادی و حریت کے ساتھ ان کے احکام و اعمال کا انتقاد، امور مہمہ میں خلفا کا اہل الرائے اور ارباب حل و عقد سے استشارہ بیت المال کی شخصی حرمت اور اس کا خزینہ عمومیہ میں ہونا اس امر کا محکم ترین ثبوت ہے۔ کہ اسلام میں حکومت جمہور ملک کی طاقت کا نام ہے وہ کوئی شخصی استبداد نہیں۔

تمام اہل ملک مراتب حقوق، قانون اور قواعد مملکت میں مساوی ہیں	درحقیقت یہ اسلام کی واضح ترین خصوصیت ہے۔ کہ اس کی نظر میں

۲

جبلہ بن ایہم غسانی ایک عیسائی شہزادے نے عہد فاروقی میں اسلام قبول کیا تھا۔ طواف کعبہ کے موقع پر اس کی چادر کا ایک گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا اس نے برابر کا جواب دیا جبلہ غصے سے بے تاب ہو گیا۔ اور حضرت عمر کے پاس آکر شکایت کی۔ آپ نے سن کر کہا۔ "تم نے جیسا کیا تھا۔ ویسی ہی اس کی سزا بھی پائی۔ اس نے کہا۔ ہمارے ساتھ کوئی گستاخی کرے، تو اس کی سزا قتل ہے۔" مگر حضرت عمر نے فرمایا: "ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا۔ لیکن اسلام نے شریف و ذلیل اور پست و بلند کو ایک کر دیا" جبلہ اس ضد میں پھر عیسائی ہو گیا۔ اور روم بھاگ گیا۔ لیکن خلیفہ اسلام نے مساوات اسلامی کی قانون شکنی گوارا نہ کی۔

مساوات قانونی کو چھوڑ کر اسلام

خود آنحضرت کا اسوۂ حسنہ کی عام طرز مساوات پر غور کرنا

چاہیئے۔ آنحضرت تمام مسلمانوں کے آقا اور سردار تھے۔ تاہم آپ نے عام مسلمانوں سے اپنے لیے کبھی کوئی امتیاز نہیں چاہا۔ ایک سفر میں کھانا پکانے کے لیے صحابہ نے کام تقسیم کر لئے۔ تو جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت سرور کائنات نے خود اپنے ذمہ لی۔

حضرت انس دس برس خدمت نبوی میں رہے۔ لیکن ان کا بیان ہے کہ اس مدت طویل میں میں نے جتنی خدمت آپ کی کی۔ اس سے زیادہ آپ نے میری کی۔ مساوات کا یہ عالم تھا کہ "ما قال لی فی شی لما فعلت" یعنی تم نے یہ کام

ہوئی۔ زید بن ثابت کے ہاں مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عمر جب ان کے پاس گئے تو انھوں نے تعظیم کے لئے جگہ کردی، حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ابن ثابت یہ پہلی بے انصافی ہے جو تم نے اس مقدمے میں کی"۔ یہ کہہ کر اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے (کتاب الخراج)

اسی طرح حضرت امیر جب ایک مقدمہ میں مدعا علیہ بن کر آئے تو ان کو مدعی کے برابر کھڑا ہونا پڑا۔ (عقد الفرید)

عہد عباسیہ میں حکومت اسلامی کی خصوصیات بہت کم باقی تھیں لیکن پھر بھی جب مدینہ کے قلیوں نے خلیفہ منصور پر دار القضاد میں دعویٰ کیا۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تو خلیفہ کو تنہا ان قلیوں کے دوش قاضی کے سامنے آنا پڑا۔ مامون کے دربار میں اس کے بیٹے عباس پر ایک بڑھیا نے نالش کی اور شہزادہ عباس کو بر سر دربار بڑھیا کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے مقدمہ کی سماعت کرنی پڑی۔

قانون اسلامی میں قریب و بعید کا بھی کوئی امتیاز نہیں آنحضرت صلعم نے صاف فرمادیا:۔

عن عبادۃ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلعم اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذ کم فی اللہ لومۃ لائم (ابن ماجہ کتاب الحدود)	خدا کے حدود یعنی خدا کے مقرر کردہ قوانین و آئین دور و قریب، رشتہ دار و غیر رشتہ دار سب پر یکساں جاری کرو اور خدا کے معاملہ میں تم ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہ کرو۔

عظمت کا تماشا دیکھنے کے لئے امنڈ آیا تھا - یہ واقعہ مشہور ہے - تفصیل کی ضرورت نہیں -

واقعہ اجنادین میں رومی سپہ سالار نے ایک جاسوس مسلمانوں کے دریافت حال کے لئے لشکر اسلام میں بھیجا جاسوس اسلام کے ان سچے نمونوں کو دیکھ کر جب واپس آیا۔ تو رومی سپہ سالار سے ایک تحیر کے عالم میں بول اٹھا :-

هم بالليل رهبان و بالنهار	یہ لوگ راتوں کو استغراق عبادت
فرسان لو سرق ابن ملکهم	میں راہب ہوتے ہیں مگر دن کو شہسوار
قطعوه - و ان زنی رجموه -	اگر ان کا شہزادہ بھی چوری کرے

تو ہاتھ کاٹ ڈالیں۔ اور اگر زنا کرے تو اسے بھی رجم کریں -

خصائص مسلم کی یہ اصلی تصویر تھی -

مساوات قانونی کی ایک مثال

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی - قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنے کے لئے حضرت اسامہ کو آمادہ کیا۔ جن کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے - لیکن جب اس واقعہ کے متعلق اسامہ نے آپ سے سفارش کی تو آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا -

" اے لوگو ! تم سے پہلے قومیں اس لئے ہلاک کی گئیں - کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا (چوری کا ذکر صرف خصوصیت واقعہ کی بنا پر ہے ورنہ اس سے مراد عام جرائم ہیں) تو لوگ اس کو چھوڑ دیتے تھے - پھر جب کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے -

بیٹانا جھڑکی دینا تو بڑی بات ہے۔ کبھی آپ نے اتنا بھی نہ کہا۔ کہ فلاں کام یوں سے یوں کیوں کیا۔

غلام اور آقا ایک صحابی نے اپنے غلام کو مارا تو آپ نے فرمایا۔

یہ تمھارے بھائی ہیں۔ جن کو خدا نے تمھارے ہاتھ میں دیا ہے۔ جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ۔

اسلام نے نہایت شدت کے ساتھ اس سے روکا کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو خواہ وہ کیسا ہی ادنیٰ درجہ کا کیوں نہ سمجھا جاتا ہو "غلام" اور "باندی" کہے۔ کیونکہ سب خدا ہی کے غلام ہیں۔ اسی طرح غلاموں کو فرمایا کہ اپنے مربیوں کو آقا نہ کہیں کہ مساوات اسلامی میں اس سے فرق آتا ہے۔

ایک بار ایک صحابی نے آنحضرت کو ان الفاظ سے خطاب کیا کہ "اے آقائے من" آپ نے فرمایا "مجھ کو آقا نہ کہو۔ آقا تو ایک ہی ہے یعنی خدا۔

صحابہ کا طرز عمل خلفائے راشدین جو تعلیم اسلامی کے زندہ پیکر تھے ان کا بھی ہمیشہ یہی طرز عمل رہا۔ حضرت عمر اور ان کا غلام سفر بیت المقدس میں باری باری سے سوار ہوتے تھے۔ بیت المقدس کے جب قریب پہنچے تو غلام کی باری تھی غلام نے عرض کیا کہ آپ سوار ہوں کہ شہر نزدیک آگیا۔ آپ نے نہ مانا۔ اور آخر خلیفۂ اسلام بیت المقدس میں اس طرح داخل ہوا۔ کہ اس کے ہاتھ میں اونٹ کی مہار تھی اور اونٹ پر اس کا غلام سوار تھا۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا۔ جب کہ تمام شہر خلیفہ اسلام کی شان

ساتھ یاد کرتی ہے

ہم کو یورپ کی ان عدالتوں کا نشان دو جہاں بادشاہِ وقت ایک معمولی فردِ رعایا کے دعویٰ کی جواب دہی کے لئے آکھڑا ہو۔ کیونکہ ہم نہ صرف مدینے کی اس سادہ عدالت کدہ مسجد ہی میں نہیں۔ بلکہ دمشق اور بغداد کے پُرشوکت عدالت خانوں میں بھی ایسا ہی دیکھ رہے ہیں۔ ہم کو وہ قانون تبلاؤ۔ جس نے چوری کی سزا سپاہی کے لڑکے کی طرح بادشاہ کی لڑکی کو بھی دینی چاہی ہو۔ کیونکہ عرب کے اس کے قدوس بادشاہ کا اعلان ہم پڑھ رہے ہیں۔ جو بادشاہوں کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

کیا آج بھی قانون عملاً ادنیٰ و اعلیٰ میں تمیز نہیں کرتا؟ کیا کل کی بات نہیں ہے۔ کہ انگلستان میں ایک مدعی کے جواب میں پارلیمنٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ بادشاہ عدالت میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ عدالت اُس کے نام سمن جاری کر سکتی ہے۔ یہ اعلان ہی نہیں ہے۔ بلکہ قانون ہے۔ کیونکہ قانون نے بایں ہمہ ادعاء مساوات بادشاہ کو عدالت کی حاضری سے بری اور مستثنےٰ کر دیا ہے۔

صدیوں کی جدوجہد کے بعد دنیا کا آج حاصل حریت اس سے زیادہ نہیں۔ پھر وہ دعوت کیسی مقدس و محترم اور وہ موید من اللہ ہاتھ کیسا عظیم و جلیل تھا۔ جس نے چھٹی صدی کی تاریکی میں حقیقی حریت و مساوات انسانی کا چراغ روشن کیا۔ اور اعلان کر دیا۔

" لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت، لقطعت یدیھا" صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

...... بہ ۔ لیکن خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی ۔ تو اس کے ہاتھ بھی ضرور کاٹے جاتے ۔" (بخاری الشفاعۃ فی الحدود)

یہ ہے اسلام کی فرمانروائی کی اصلی تصویر اور یہ ہے ۔ وہ مساوات کی حقیقی تعلیم جس کے ساتھ اعمال نبوت کا اسوۂ حسنہ بھی پیش کر دیا گیا تھا ۔ یہ سچ ہے کہ انقلاب فرانس نے یورپ کو استبداد و تسلط اور امتیاز افراد سے نجات دلائی ۔ اور اس نے معلوم کیا ۔ کہ ہر انسان بلحاظ انسان ہونے کے انسان ہے ۔ اگرچہ وہ سر پر تاج اور ہاتھ میں عصار حکومت رکھتا ہو ۔ لیکن بایں ہمہ آج بھی جب کہ تمام یورپ سے شخصی فرمانروائی کا جنازہ اٹھ چکا ہے جب کہ قانون کی عزت سب سے بالاتر سمجھی جاتی ہے جب کہ مساوات و آزادی کے حامیوں سے اس کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے ۔ ایک نظیر بھی ایسی پیش کی جا سکتی ہے جس میں فرمانروائے وقت نے ایسے صاف اور سچے لفظوں میں مساوات انسانی کا اعلان کیا ہو ۔ اور خود اپنے اوپر اس کا نمونہ پیش کرنے کے لئے آمادہ ہو ۔

انگلستان میں پادشاہ قانون کے تابع بیان کیا جاتا ہے اور امریکہ و فرانس میں پریذیڈنٹ ایک عارضی مشورہ فرمائے حکومت سے زیادہ نہیں لیکن واقعات و نظائر کے جمع کرنے پر متوجہ ہوں ۔ تو صدہا واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے ۔ کہ قانون نے اس دور مدنیت و آزادی میں بھی اعلیٰ و ادنیٰ اور پادشاہ و رعایا کا ویسا ہی فرق قائم رکھا ہے جیسا کہ ہندوستان میں منو کے زمانے میں تھا ۔ یا دور مظلمہ کی ان انسانی پرستش گاہوں کے عہد میں، جس کو آج تاریخ لعنت و نفرین کے

امتداد زمانہ نے خصوصیات اسلام بہت کچھ مٹا دیئے۔ تاہم اس دفعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج تہذیب ترین ممالک میں سیاہ سپید قومیں اپنی عبادت گاہوں میں ایک دوسرے کے ساتھ میں ایک ادنیٰ ترین مسلمان ایک امیر الامرا بلکہ شاہِ افغانستان کے پہلو بپہلو کھڑا ہوتا ہے۔ اور کوئی اس کو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا۔ کہ اسلام میں مساوات نہیں؟ اور اس بارے میں وہ آج یورپ سے درس تربیت لینے کا محتاج ہے۔

نظام جمہوری کا تیسرا رکن

امام یا خلیفہ کا تقرر انتخاب عام سے ہو۔ اور دوسروں پر حقوق میں اسکو کوئی ترجیح نہ ہو

اس مبحث کو ہم دو حصوں میں بیان کریں گے۔

(۱) تاریخ شاہد ہے کہ خلفائے راشدین میں سے کسی کا تقرر بحق وراثت یا باستبداد رائے نہیں ہوا۔ بلکہ مجمع عام میں مہاجرین و انصار کی کثرت رائے سے (جو بمنزلہ ارکان خاص تھے) اور عام مسلمانوں کے قبول سے ہوا۔ (جو بمنزلہ ارکان عام تھے) حضرت ابوبکر کا انتخاب نشست گاہ بنو ساعدہ میں حضرت عمر کی تحریک۔ مہاجرین و انصار کی تائید اور عامۂ مسلمین کی پسندیدگی سے ہوا۔ حضرت عمر کا انتخاب حضرت ابوبکر کی تحریک، مہاجرین و انصار و عامۂ مسلمین کی تائید اور عامۂ مسلمین کی پسندیدگی سے ہوا۔ حضرت عمر کا انتخاب حضرت

خلیفۂ اوّل کا اعلانِ حق اور مساوات کا تخیلِ عمومی

حضرت ابوبکر نے جو پہلی تقریر کی تھی۔ اس کے حسب ذیل فقرے پڑھو:-

وان اقویٰکم عندی الضعیف حتّٰی اخذ له بحقه وان اضعفکم عندی القوی حتّٰی اخذ منه الحق	تم میں جو قوی ہے۔ وہ میرے نزدیک ضعیف ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں، اور جو ضعیف ہے وہ قوی ہے۔ تا آنکہ میں اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں۔

(ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۲۹)

اس مساوات کی تعلیم نے پیروان اسلام کے قلب دماغ کو حریت و مساوات کے تخیل سے لبریز کر دیا تھا۔ فارس کی لڑائی میں جب مغیرہ بن سعد ایرانی سپہ سالار کے پاس سفیر بن کر گئے اور تخت پر اُس کے برابر بیٹھ گئے تو درباریوں نے یہ سوء ادب دیکھ کر تخت سے اتار دیا تھا۔ اس پر ان کے مُنہ سے کس بے ساختگی کے ساتھ یہ الفاظ نکلے ہیں:-

انا نحن معشر العرب لا یتعبد بعضنا بعضا۔	ہم مسلمانوں میں تو ایک دوسرے کو غلام سمجھنے کا دستور نہیں ہے۔
(طبری صفحہ ۱۰۸)	یہ تمہارا کیا ہے؟

ان یردوا انما الشوری
للمهاجرین والانصار
فان اجتمعوا علیٰ رجل وسموه
اماماً کان ذلک رضی فان
خرج من امرهم خارج
بطعن او بدعة ردوه
الی ماخرج منه فان ابیٰ
قاتلوه علیٰ اتباعه غیر
سبیل المومنین
(نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۷)

کو حق نہیں۔ کہ اپنی رائے پر اڑا رہے اور جو غیر حاضر ہو اس کو حق نہیں کہ اپنی غیر حاضری کی بنا پر انتخاب کو رد کر دے۔ حق مشورہ مہاجرین انصار کو ہے۔ اگر وہ کسی ایک شخص پر متفق الرائے ہو جائیں۔ اور اس کو امام مقرر کر دیں۔ تو یہ ان کو رضائے عام پر دال ہے۔ پس اگر کوئی ان کی متفق علیہ رائے سے کسی طعن یا بدعت کے سبب سے علیحدہ ہو۔ تو ان پر واجب ہوگا۔ کہ جس سے وہ علیحدہ ہوا۔ اس کے قبول پر وہ مجبور کیا جائے۔ اگر وہ اب بھی نہ مانے تو اجماع رائے مسلمین کی بنا پر اس سے جنگ کریں۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ جناب امیر نے ان چند فقروں میں انتخاب خلافت و جمہوریت کے تمام ارکان کی بہترین تفصیل کر دی ہے۔ اور ایسی تفصیل جس سے بہتر تفصیل آج بھی نہیں ہو سکتی۔

ابوبکر کی تحریک، مہاجرین وانصار وعامہ مسلمین کی تائید وقبول سے ہوا۔ حضرت عثمان کو عبدالرحمان بن عوف وغیرہ کی ایک نیابی مجلس کے انتخاب اور عام اہل مدینہ کے مشورہ سے خلیفہ بنایا گیا۔ اسی طرح حضرت امیر اہل مصر و اہل مدینہ کی تجویز و قبول سے خلیفہ منتخب ہوئے۔

حضرت عمرؓ نے تو صاف فرمادیا "لاخلافۃ الا عن مشورہ" (کنزالعمال صفحہ ۱۳۹ جلد ۳) یعنی خلافت صرف عام مشورہ سے طے ہوسکتی ہے۔ شریعت میں اس کے تعین کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

واقعۂ تحکیم میں حضرت امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ کی معزولی میں قوم ہی کی رائے سے مدد لینی پڑی۔ گو اس میں امیر معاویہ کے نائب نے مکر و خدع سے کام لیا تھا۔ اور قوم کو دھوکا دینا چاہا تھا۔

حضرت امیر کی تصریح:۔ امیر معاویہ نے حضرت امیر علیہ السلام کو لکھا تھا۔ کہ تم کو خلیفہ کس نے بنایا؟ حضرت جواب میں فرماتے ہیں:۔

انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان وعلی ما بایعوھم علیہ، فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب

جس قوم نے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کی بیعت کی تھی۔ اور جن شرائط پر بیعت کی تھی۔ اسی نے انہی شرائط پر میری بھی بیعت کی۔ جو مجلس انتخاب میں موجود ہو اس

جھنجھوڑا۔ لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا، بلکہ غفلت وانکار کی ساری سُنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے۔ جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا۔

دُورافتادہ صدا

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں۔ یا ایک دور افتادہ صدا۔ جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا۔ وہاں میرے بال و پر کاٹ دیے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے۔ اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں۔ اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔

مرض الموت

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا۔ جب میں نے تمھیں کہا تھا۔

شاہجہاں کی مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں کھو دیا ہے؟

(مولانا ابوالکلام آزاد)

عزیزانِ گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہان کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں۔ تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد آج تمہارے چہروں کو اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں۔ تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے۔ میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا۔ تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست، جو تمہیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے۔ اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پہ

ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا:۔

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جاچکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ:۔

تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا۔ ملک کی آزادی کے بارے میں وہ روبہ اختیار کیا جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان آزاد ہے۔ اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعے کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے یہ وہی جھنڈا ہے۔ جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزاد قہقہے مسخر کیا کرتے تھے۔

وقت کی انگڑائی

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے۔ اور یہی وہ انقلاب ہے۔ جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم سے کوئی اچھی شے چھن

کہ ڈرپوک قوموں کی حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کردی۔ اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا۔ وہ تمہیں لا وارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

بساط الٹ گئی

انگریزی کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی۔ اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے۔ وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے۔ اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ۔ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک تھا جس نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے

نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے۔ وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لئے موجب حیرت ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے۔ کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں سوچ بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ اسی خیال سے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں۔ ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دئے گئے ہیں۔ ہراس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کرسکتا۔

دعوتِ انقلاب ———— میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے۔

گئی۔ اور اس کی جگہ بُری شے آگئی۔ ہاں تمہاری بے قراری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تیئں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے ہی کو ملجا و ماوی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے۔ اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آگیا ہے۔

سیاسیات میں ذاتیات

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور کبھی اس پر خارزاری میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن آج مجھے جو کہنا ہے۔ میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے۔ جو ہم نے اپنی آنکھوں دیکھے۔ اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ

غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے مجتمع جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ تو یہ عیب کی بات نہیں یہ دیکھو کہ تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں۔ تو ان کو اپنے اس خدا کو جلوہ گاہ بناؤ۔ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا:۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ؎ جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی کی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔ ہوائیں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر بھی۔ لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ۔ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

حرفِ شکایت

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا بستر ہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر ابھی بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں۔ اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی۔ تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمہارے

جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے۔ اس پر بھی غور کرو۔ تمھیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ۔ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو۔ اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو۔ اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

بے جا جوش اور بے جا ہراس

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بے جا تھا۔ اسی طرح آج تمھارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے

کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔
آج زلزلوں سے ڈرتے ہو۔ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کی سبیل کیا ہے۔ کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے۔ جو سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دئے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رُخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں۔ کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ وہ بس اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں۔ اور بار بار کہتا ہوں۔ اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم

اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہوگئی ہے۔ تو پھر اسی طرح بدلو۔ جس طرح تاریخ نے اپنے تیں بدل لیا ہے۔

آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں۔ اور ہم انہی صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہیں ۔؟

سورج سے کرنیں چھین لو

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ ہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے۔ لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو۔ اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو۔ جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو۔ اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں۔ وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انہیں بھلاؤ نہیں۔ انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لئے ہیں۔ اور اس

دنیا کی تمام طاقتوں سے باغی ہوکر
خدا کے وفادار بن جاؤ

مولانا آزاد کا پیغام

لوگ دنیا میں سینکڑوں قوتوں کے محکوم ہیں۔ ماں باپ کے محکوم ہیں۔ دوست و احباب کے محکوم ہیں۔ استاد و مرشد کے محکوم ہیں۔ امیروں۔ حاکموں اور بادشاہوں کے محکوم ہیں۔ اگرچہ وہ دنیا میں بغیر کسی زنجیر اور بیڑی کے آئے تھے۔ مگر دنیا نے ان کے پاؤں میں بہت سی بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

لیکن مومن مسلم ہستی وہ ہے۔ جو صرف ایک ہی کی محکوم ہے اس کے گلے میں محکومی کی ایک بوجھل زنجیر ضرور ہے۔ مگر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی بہت سی ہلکی زنجیریں نہیں ہیں۔ وہ ماں باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ایک ہی حاکم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ دوستوں سے محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسے رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ سچے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ اپنے ہر بزرگ اور بڑے کا ادب ملحوظ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے ادب آموز حقیقی

کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لادوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمال صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

زباں زنطق فرو ماند و از من باقی است
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی است

حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں اپنے ساتھیوں سے کیا پوچھا ؟

ارباب متفرقون خیرام اللہ الواحد القہار (۱۲)

(۳۹) بہت سے معبود بنا لینا بہتر ہے ؟ ایک ہی قہار اور مقتدر خدا کو پوجنا ؟

یہی وہ عناصر ایمان و اسلام ہے۔ جس کی ہر مومن و مسلم کو قرآن کریم نے تعلیم دی ہے کہ :۔

ان الحکم الا للہ امر الا تعبد الا ایا

"د تمام جہان میں اللہ کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں۔ اور نہ کسی کو اپنا معبود بنائیں" ؛

یہی دین قیم ہے ۔ جس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے ۔

حدیث صحیح ہے کہ فرمایا :۔

ذالک الدین القیم و لکن اکثر الناس لا یعلمون

جس بات کے ماننے میں خدا کی نافرمانی ہو۔ اس میں کسی بندے کی فرمانبرداری نہ کرو۔

اسلام نے یہ کہہ کر فی الحقیقت ان تمام ماسوائے اللہ اطاعتوں اور فرمانبرداریوں کی بندشوں سے مومنوں کو آزاد و حر کامل بنا دیا ۔ جن کی بیڑیوں سے تمام انسانوں کے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے ۔

نے اسے ہی تبلایا ہے ۔ وہ بادشاہوں اور حاکموں کا حکم بھی مانتا ہے ۔ وہ دنیا کے ایسے بادشاہوں کی اطاعت بھی کرتا ہے ۔ جو اس کے آسمانی بادشاہت کی اطاعت کرتے ہیں ۔ کیونکہ اسے تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرے لیکن یہ سب کچھ جو وہ کرتا ہے ۔ تو اس لیے نہیں کرتا ۔ کہ ان سب کے اندر کوئی حکم ماننا اور ان کو جھکنے کی جگہ سمجھتا ہے ۔ بلکہ صرف ایک ہی کے لئے ہے ۔ اور حکم صرف ایک ہی کا ہے جب اس ایک ہی حکم دینے والے ان سب باتوں کا حکم دے دیا ۔ تو ضرور ہے ۔ کہ خدا کے لئے ان سب بندوں کو بھی مانا جائے اور اللہ کی اطاعت کی خاطر وہ اس کے بندوں کا بھی مطیع ہو جائے ۔

پس فی الحقیقت اس دنیا میں ہر انسان کے لئے بے شمار حاکم اور بہت سی جھکانے والی قوتیں ہیں ۔ لیکن مومن کے لئے صرف ایک ہی ہے ۔ اس کے سوا کوئی نہیں ۔ وہ صرف اسی کے آگے جھکتا ہے ۔ اور صرف اسی کو مانتا ہے ۔ اس کی اطاعت کا حق ایک ہی کو ہے اس کی پیشانی کے جھکنے کی چوکھٹ ایک ہی ہے ۔ اور اس لئے دل کی خریداری کے لئے بھی ایک ہی خریدار ہے ۔ وہ اگر دنیا کی کسی ہستی کی اطاعت کرتا بھی ہے ۔ تو صرف اسی ایک کے لئے اس لئے اس کی بہت سی اطاعتیں بھی اس ایک ہی اطاعت میں شامل ہو جاتی ہیں ۔

منفصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست ہر جا کنیم سجدہ بر آں آستاں رسد

دراصل ایک ہی تھا۔ اور یہ سب رشتے اسی ایک رشتے کی خاطر تھے حکم ایک ہی تھا۔ اور یہ سب اطاعتیں اسی ایک اطاعت کے لئے تھیں جب ان کے سامنے بھی اس سے انکار اور ان کی وفاداری میں اس سے بغاوت ہونے لگی۔ تو جس کے حکم سے رشتہ جوڑا تھا۔ اسی کی تلوار نے کاٹ بھی دیا۔ اور جس کے ہاتھ نے ملایا تھا۔ اسی کے ہاتھ نے الگ بھی کر دیا۔ سرورِ کائنات اور سید المرسلین (صلعم) سے بڑھ کر مسلمانوں کا کون آقا ہو سکتا ہے؟ لیکن خود اس نے بھی جب عقبہ میں انصار سے بیعت لی۔ تو فرمایا۔ کہ میری اطاعت تم پر اس وقت تک کے لئے واجب ہے۔ جب تک میں تم کو نیکی کا حکم دوں۔ جب اسی شہنشاہ کونین کی اطاعت مسلمانوں پر نیکی و معروف کے ساتھ مشروط ہے تو پھر دنیا میں کون بادشاہ۔ کون سی حکومت کون سا پیشوا۔ کون سے رہنما اور کونسی قومیں ایسی ہو سکتی ہیں۔ جن کی اطاعت ظلم کے بعد بھی ہمارے لئے باقی ہے۔

آدم کی اولاد دو کی محکوم نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک سے ملے گی۔ دوسرے کو چھوڑے گی۔ ایک سے جڑے گی۔ دوسرے سے کٹے گی۔ پھر خدا را مجھے بتاؤ۔ کہ ایک مومن کس کو چھوڑے گا۔ اور کس سے ملے گا؟ ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔ ایک باقی رہے گا۔ ایک کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر مجھے بتاؤ۔ کہ مومن کی اقلیم کس کی بادشاہت قبول کرے گی۔ کیا وہ اس سے ملے گا جس کی حالت یہ ہے۔

اور اس ایک ہی جملہ میں انسانی اطاعت اور پیروی کی حقیقت اس وسعت اور امالہ کے ساتھ سمجھا دی۔ کہ اس کے بعد اور کچھ باقی نہ رہا۔ یہی ہے جو اسلامی زندگی کا دستور العمل ہے۔ اور یہی ہے جو مومن کے تمام اعمال و اعتقادات کی ایک مکمل تصویر ہے۔ اس تعلیم الٰہی نے تبلا دیا ہے۔ کہ جتنی اطاعتیں۔ جتنی فرمانبرداریاں جتنی دیانت داریاں اور جس قدر بھی تسلیم و اعتراف ہے۔ صرف اسی وقت تک کے لئے ہیں۔ جب تک کہ بندے کی بات ماننے سے خدا کی بات نہ جاتی ہو۔ اور دنیا والوں کے وفادار بننے سے خدا کی حکومت کے آگے بغاوت نہ ہوتی ہو۔ لیکن اگر کبھی ایسی صورت پیش آ جائے۔ کہ اللہ اور اس کے بندوں کے احکام میں مقابلہ آ پڑے۔ تو پھر تمام اطاعتوں کا خاتمہ تمام عہدوں اور شرطوں کی شکست تمام رشتوں اور ناطوں کا انقطاع اور تمام دوستوں اور محبتوں کا اختتام ہے۔ اس وقت نہ تو حاکم حاکم ہے اور نہ بادشاہ بادشاہ۔ نہ باپ باپ ہے نہ بھائی بھائی۔ سب کے آگے تمرد سب کے ساتھ انکار سب کے سامنے سرکشی۔ سب کے ساتھ بغاوت، پہلے جس قدر نرمی تھی۔ اتنی ہی اب سختی چاہیئے۔ پہلے جس قدر اعتراف تھا۔ اتنا ہی اب تمرد چاہیئے پہلے جس قدر فرمانبرداری تھی۔ اتنی ہی اب نافرمانی مطلوب ہے۔ پہلے جس قدر جھکاؤ تھا۔ اتنا ہی اب غرور ہے۔ کیونکہ رشتے کٹ گئے۔ اور عہد ڈالے گئے۔ رشتہ

خزانے ان کے کام نہ آئیں گے۔ ان کی طاقتیں نیست ونابود کر دی جائیں گی۔ ان کا تاجِ غرور ان کے سر سے اتر جائے گا ان کا تخت جلال وعظمت واژگوں نظر آئے گا۔

ويقطعون ما امر الله به ان يوصل (۲۰۵۰۲)

خدا نے جس کو جوڑنے اور ملانے کا حکم دیا ہے وہ اسے توڑتے اور جدا کرتے ہیں۔"

اور کیا اس کی بادشاہت سے گردن موڑے گا۔ جو پکارتا ہے کہ يا ايها الانسان ما غرك بربك الكريم (۸۲: ۶)

"اے غافل انسان کیا ہے۔ جس کے گھمنڈ نے تجھے اپنے مہربان اور پیار کرنے والے آقا سے سرکش بنا دیا ہے؟ مگر آہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

كيف تكفرون بالله وكنتم امواتا فاحياكم ثم يميتكم ثم يحييكم ثم اليه ترجعون (۲: ۲۸)

تم اس شہنشاہ حقیقی کی حکومت سے کیونکر انکار کرو گے جس نے تمہیں اس وقت زندہ کیا جب کہ تم مردہ تھے وہ تم پر پھر موت طاری کرے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندگی بخشے گا۔ پھر تم سب اسی کے پاس بلائے جاؤ گے۔

دنیا اور اس کی بادشاہیاں کافی ہیں۔ ان کے جبروت و جلال کو ایک دن ملنا ہے۔ خدائے منتقم و قہار کے بھیجے ہوئے فرشتے ہلاکے عذاب انقلاب و تغیرات کے حربے لے کر اترنے والے ہیں ان کے قلعے مسمار ہو جائیں گے۔ ان کی تلواریں کند ہو جائیں گی۔ ان کی فوجیں ہلاک ہو جائیں گی۔ ان کی توپیں ان کو پناہ نہ دیں گی۔ ان کے

پیمانے سے ناپتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب موجودہ دور یعنی عہد حاضر ہے۔ ہم نے تاریخ میں مختلف قوموں کی جو کہانیاں اور قصے پڑھے ہیں۔ آج واقعات ہم پر گزر رہے ہیں اب ہم دریا کے کنارے سے نہیں بلکہ دریا کے اندر ہیں۔ ہم دور سے کسی چیز کا نظارہ نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ تمام حالات ہم پہ طاری ہو رہے ہیں۔ ایک سیلاب ہم کو بہائے لئے جا رہا ہے اور ہم اس ریلے میں بہے چلے جا رہے ہیں لیکن جو شخص ایک مورخ کی حیثیت سے دور کھڑا ہو کر دیکھنے کی کوشش کریگا۔ اس کی نگاہیں صحیح اندازہ لگا سکیں گی۔ کہ ہم کس دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو وقت کے مزاج اور خاصیت سے محفوظ نہیں کر سکتے۔ ایک شخص خواہ کتنا ہی ذہانت رکھتا ہو۔ وہ گرد و پیش حالات سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا ہے۔

آج مسٹر چرچل ایک خاص اثر اور دائرے میں محصور ہے۔ وہ غفلت کے دائرے میں محصور ہے۔ اگر یہی شخص کیمرج یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوتا۔ تو وہ گزشتہ تاریخ کو پیش نظر رکھ کر زمانہ حال کے متعلق اپنی رائے قائم کرتا۔ اور آج وہ جو غلطی کر رہا ہے۔ اس سے بچ جاتا۔ اس کا تجربہ کام نہیں کرتا۔ اس کا دماغ اور عقل دونوں کام کرنے سے محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن اگر آج اسے کسی کالج میں تاریخ کا پروفیسر بنا دیا جائے۔ تو وہ رفتار زمانہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ مرتب باتیں ہمارے سامنے پیش کرے گا۔

یہ قدرت کے قوانین ہیں۔ موجودہ عہد میں صرف وہی دماغ صحیح طور پہ کچھ سوچ اور فکر کر سکتے ہیں۔ جو اپنے کو پانی کی سطح سے اوپر رکھ کر سانس لے سکیں جو سر کے نیچے کرے گا۔ وہ ڈوب جائے گا۔ آج ہندوستان کی حالت کیا ہے۔ اس

انگریزی حکومت کے خلاف جو جہاد یک بار میرا فرض ہے اس میں لکڑیاں ڈال دوں

(لاہور میں جمعیت علماء کے اجلاس میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی بصیرت افروز تقریر)

لاہور ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء۔ آج جمعیت علماء کے اجلاس کے سبیع پنڈال باغ بیرون دہلی دروازہ میں حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد تقریر کے لئے تشریف لائے۔

آپ نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا مزاج اور اس کی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ قدرت نے ہر چیز کے مزاج میں ایک ایسا قانون بنا دیا ہے۔ جو اٹل اور امٹ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جماعتیں۔ قوموں اور ملکوں کی زندگی کا بھی ایک خاص مزاج اور خاصیت ہے اور جب اس مزاج اور خاصیت میں کوئی خلل اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ ایک ایسی کیفیت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور ہم جسے اپنی اصطلاح میں مرنے کے نام سے تعبیر کرتے ہیں میں جو چیز بیان کر رہا ہوں وہ ذرا باریک ہے۔ آج ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے وہ وہی ہے۔ جو دنیا کی سینکڑوں قوموں اور ملکوں گزر رہا ہے۔ آج سے مراد وہ وقت نہیں ہے۔ جس کو ہم ۲۴ گھنٹے کے

ہندوستان غیر ملکی اقتدار کے پنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ اس میں مختلف حصّے اور قومیں آباد ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ بحیثیت ایک ہندستانی مسلمان ہونے کے مستقبل کے متعلق بھی جملہ فیصلہ کرنا چاہیئے۔ یہاں پر ٹہینوں اور پھلوں کی پرستش ہو رہی ہے۔ مگر اصل چیز جڑ ہے۔ میں آنے والے زمانے کو کمزوری اور تذبذب سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ عزم، ہمت اور حوصلے سے دیکھ رہا ہوں جو قوم اپنے آپ کو بچانے پر قادر نہ ہو۔ اس کو تحفظات نہیں بچا سکتے۔ کاغذوں کے پرزوں پر لکھے ہوئے قانون تمہیں محفوظ نہیں کر سکتے سب سے پہلے آپ اپنے اور پاؤں کی نسوں کو مضبوط کر لیں ۳۸ برس سے یہ آواز بلند کر رہا ہوں۔ لیکن سننے والے کان میں کہاں سے لاؤں۔

مسلمانوں کی تعداد ۹ کروڑ ہے۔ اگر ۹ کروڑ کے بجائے مسلمان ۹ لاکھ بھی ہوتے اور ان کے دل میں یہ خیال ہوتا کہ مرنے کے لئے نہیں زندہ رہنے کے لئے ہیں۔ تو کوئی قوم ان کو نہیں مٹا سکتی۔ میری جگہ کمزوری اور تذبذب کی نہیں ہے۔ بلکہ یقین اور ایمان کی ہے ۹ کروڑ ہوتے ہوئے اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم فنا ہو جاؤ گے۔ مٹ جاؤ گے۔ تو اس کا کیا علاج ۹ کروڑ لاشوں کو کوئی تحفظ اور کوئی دستور نہیں بچا سکتا ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ انگریز بہادر بچا سکتا ہے۔ تو وہ بھی نہیں بچا سکتا ہے۔ اور اگر نہیں تو جب وہ اپنا بوریا بستر باندھے جیسے کہ اب باندھ چکا ہے۔ تو اس کو ٹ سے ہاتھ ڈال کر پکڑنا اور روک لینا دنیا میں صرف تعداد ہی نہیں بلکہ دوسری چیزیں بھی کام آتی ہیں۔ میرے سینے میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے۔ میں وہی حرارت آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اور میرا اسلام سب مجھے

پر ڈیڑھ سو برس سے ایک غیر ملکی حکومت مسلط ہے۔ وہ اپنی خود غرضی کے مطابق اس کو ڈھال رہا ہے۔ اس کا ایک مزاج ہے۔ اور اس کی ایک خاصیت ہے۔ اس لئے ملک کے اندر جو فضا موجود ہے۔ وہ مسموم اور پراگندہ ہو چکی ہے۔ ہر سانس لینے والا اس زہریلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ تاریخ پرانی داستانیں دہرا رہی ہے۔ آپ الگ ہو کر ایک طرف کمرے میں بیٹھ جائیں۔ اور دیکھیں کہ آپ کا دماغ کس طرح کام کرتا ہے اور اس کے بعد پھر عمل میں چلے جائیں۔ تو آپ بے ساختہ ہر چیز کے ساتھ دوڑنا شروع کردیں گے۔ اچنبے کی بات یہ ہے کہ ہمارے حواس کام نہیں کرتے۔ بیرونی قبضہ ہمیں جس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ ہم ڈھلتے چلے جارہے ہیں۔ اس سانچے میں جو ہاتھ کام کر رہا ہے وہ ہڈی اور گوشت کا نہیں۔ بلکہ خاص اثرات کا ہے۔

اب میں ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا نقشہ بتانا چاہتا ہوں۔

میں کل لاہور آیا۔ تو مجھے ۱۹۲۱ء کا زمانہ یاد آگیا۔ جبکہ میں نے جمعیت العلماء کے جلسہ کی صدارت کی تھی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت میرے ایمان اور عزم کی جو صورت تھی اس میں اب تک ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہوئی۔ وقت کے تقاضوں سے بعض باتوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ لیکن جن چیزوں کی بنیاد ایک ٹھوس عقیدے اور حقیقت پر ہو۔ وہ نہیں بدلتے۔ میں نے ۱۸ برس کی عمر میں سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ اب تک اس پر قائم ہوں۔ میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک چراغ جل رہا ہے۔ اگر میں لاکھ انسان بھی مجھے یقین دلائیں کہ چراغ نہیں جل رہا۔ تو میں ایک مستقل حقیقت سے آنکھوں کو بند کرنے

تربیتِ عسکری اَور قُرآن حکیم

(از جناب امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد)

انسان نہایت سرکش اور متمرد ہے۔ اس نے بارہا حقوق الٰہی میں دست اندازی کی ہے۔ اس کی عظمت و جبروت کے سراپردۂ جلال کو چاک کرنا چاہا ہے۔ اس کے دامن توحید پر چنگل مارا ہے اور پتھروں بلکہ کنکریوں تک کو اس کا شریک بنا دیا ہے۔

اس نے خدا کی پاکی و تقدیسیت کو بھی اپنے انسانی جذبات کے ساتھ ملوث کرنا چاہا۔ اور اس کے صالح بندوں کو اس کا بیٹا بنایا۔

سبحانہ و تعالیٰ عما یقولون علواً کبیرا۔

اس نے کبھی کبھی غرور تکبر کے گھمنڈ میں آ کر خود اپنا نسب نامہ بھی خدا کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اور اس طرح اپنے خاندان کو تمام دنیا سے اونچا کرنا چاہا ہے۔ تعالیٰ اللہ عما یشرکون

اس نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو ساحر، مجنون، پاگل اور دیوانہ کہا ہے۔ ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی ہیں۔ ان کے ساتھ ہر موقعہ پر گستاخی کی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی خدا کے ان صالح بندوں کو قتل بھی کر دیا ہے۔

لیکن اس سرکش، انسان کا خون اس قدر گراں قیمت اور بیش بہا ہے کہ اس تمرد و طغیان پر بھی خدا نے اس کی حرمت کو قائم رکھا۔ لیکن جب سرکشی و عصیان نے بہت زیادہ سر اٹھایا اور خدا کے دائرہ عفو و کرم کے

پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں میرے لئے صرف ایک فرض رہ گیا ہے۔ اور یہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو چولہا دہک رہا ہے۔ اس میں لکڑیاں ڈال دوں۔ میں کوئی ایسا سوال اٹھانا نہیں چاہتا۔ جس سے تعمیری طاقت کے ہاتھ مضبوط ہوں دنیا میں وہی بچتا ہے۔ جس کے پاؤں کی نسیں مضبوط ہوں ؎

گر گفتہ ز عشق گہے حرف آشنا

آں ہم حکایت ست کہ از ما شنیدہ

میں آپکو آیندہ نقشوں کے بھرنے سے نہیں روکتا۔ آل انڈیا کانگرس کی صدارت کے دو برس میں میں نے جو کوششیں کیں اور مسلمانوں کے لیڈروں نے جس طرح ٹھکرایا۔ ان کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن جڑ کی چیز یہ نقشہ نہیں۔ ضرورت کو جڑ کی ضرورت ہے۔ آپ اس ابتدائی مقدمہ اور اصول کو سمجھ لیں اور سینکڑوں سوالات حل ہو جائیں گے۔ میری تمام عمر کا سرمایہ یہی ہے کہ تم محبت بھرے دل سے میری بات سنتے ہو اور عزت بھری آنکھوں سے دیکھتے ہو۔

خدا نے بھی اپنے شکنجہ عذاب کو پہلے سے زیادہ سخت کیا۔ اور جو سیادت الٰہی پہلے سے قائم تھی۔ اس کا رنگ بالکل بدل گیا۔ پہلے سیاست ربانی کا منصب صرف آسمان و زمین اور ابرو دریا کو حاصل تھا۔ جن کے عذاب کی چکی چند لمحوں کے اندر قوم کی قوم کو پیس ڈالتی تھی۔ مگر اب یہ خدمت خود انسان ہی کو بلکہ صرف انسان کے ہاتھ کی دس انگلیوں کو سپرد کر دی گئی۔ انسان جب تک خدا کے حقوق کو پامال کر رہا تھا۔ خدا اپنی عظیم الشان مخلوقات کے ذریعے سے ان کو عذاب دیتا تھا۔ اب خود انسان کے حقوق روندے جا رہے تھے۔ اس لئے خدا نے بھی انسانیت کی عزت و احترام کو قائم رکھنے کے لئے خود انسان ہی کو کھڑا کر دیا۔

زمانہ وحشت میں انسان نے کتنے انسانوں کے حقوق پامال کئے ہوں گے؟ کتنے انسانوں کو قتل کر دیا ہوگا؟ کتنے بچے ذبح کر دئے ہوں گے؟ کتنی عورتوں کے سر سے چادر عصمت اتار لی ہوگی؟ ان حقوق کے تحفظ کے لئے تلواریں بھی چمکی ہوں گی نیزوں نے بھی اپنی روانی دکھائی ہوگی۔ کمانوں کی چرچراہٹ کی آواز سے بھی وحشت کدۂ عالم گونج اٹھا ہوگا۔ لیکن تاریخ نے ان واقعات کو یاد نہیں رکھا۔ وہ اس وقت موجود نہ تھی۔ اس لئے وہ بھی ان قوموں کے ساتھ جنگل کے تاریک گوشوں اور پہاڑوں کے تنگ غاروں میں گم ہو گئی۔ البتہ زمانہ تمدن کی تاریخ نے اس قسم کے سینکڑوں واقعات کو اب تک ازبر رکھا ہے۔ اور اس آموختہ کے یاد کرنے میں سب سے زیادہ زبان تیغ نے مدد دی ہے۔ خون کے دھبوں نے ان کے نقوش رنگین کو کبھی مٹنے نہ دیا۔

حدود سے آگے بڑھ گئی۔ تو قانون تعذیب الٰہی کو بھی حرکت ہوئی اور اپنی عظیم الشان مخلوقات کو مسلط کر دیا۔ انھوں نے اس کو بداعمالیوں کی پوری پوری سزا دی۔ ثمود کو پیس کر غبار بنا دیا۔ عاد کو ہوا کے جھونکے خس و خاشاک کی طرح اڑا لے گئے۔ قوم نوح کو طوفان کا ریلا تنکے کی طرح بہا لے گیا۔

وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القری وھی ظالمۃ ان اخذہ الیم شدید۔

حقوق العباد

لیکن بااین ہمہ خدا نے اپنے حقوق کی حفاظت و احترام کے لئے کبھی بھی ایک قطرہ خون نہیں بہایا۔ خدا نے دنیا کی بڑی بڑی متمرد قوموں کو مٹا دیا۔ ان کی نسل فنا کر دی۔ ان کی یادگاروں کو برباد کر دیا لیکن وہ جس سرزمین پر آباد تھے۔ اس کے دامن پر خون کا ایک دھبہ بھی نظر نہیں آیا۔

البتہ جب انسان نے حقوق الٰہی کے حدود سے بھی آگے قدم بڑھایا۔ اور خود اپنے بھائیوں کے فطری حقوق کو پامال کرنا چاہا۔ ان کے ملک چھین لئے۔ ان کی آزادی و خودمختاری سلب کر لی۔ ان کے بچوں کی آزادانہ نشوونما روک دی۔ ان کی زمینوں پر اپنے عیش و نشاط کے محل تعمیر کئے۔ ان کے جسم سے نکلے ہوئے پسینے اور گردنوں سے بہتے ہوئے خون سے اپنی تشنگی ظلم کو تسکین دی۔ اور پوری قوم و ملک کو اپنی قومی سیادت و عظمت کے لئے ایک آلہ بے جان بنا لیا۔ تاکہ اپنی قدرتی حرکت کو چھوڑ کر صرف انہی کے اشاروں پر حرکت کریں۔ تو اس وقت

عبث ہوتا ہے۔ اور اس کو بار بار دنیا کے آگے پیش کرتی رہتی ہے اور اس اصول کی بنا پر اس نے ہم کو صرف فرعون کے مظالم کی داستان سنائی ہے جس کا انتہائی ظلم وعدوان یہ تھا کہ وہ اپنی رعایا کے اندر پھوٹ اور نااتفاقی ڈال کر حکومت کرتا تھا۔ اور ایک گروہ کو ضعیف اور دوسرے کو قوی رکھتا تھا۔

ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم

فرعون نے خدا کی زمین میں بہت سر اٹھایا۔ اور اس کے رہنے والوں میں پھوٹ ڈال کر ان کو گروہ در گروہ کر دیا۔ اور ان میں سے ایک جماعت کو کمزور رکھتا اور ابھرنے نہ دیتا۔"

مذہبی حکومتوں کے سوا ظلم ہر غیر نبوی سلطنت کا مایہ خمیر ہے اور باوجود مختلف قسم کے مظالم کے وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر لیتی ہیں۔ جو خدا نے ان کے لئے مقرر کر دئے ہیں لیکن جب کوئی سلطنت ظلم کو اس انتہائی درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ کہ انسانی حقوق کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا تو یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا تاج وتخت الٹ دیا جاتا ہے اور وہ صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دی جاتی ہے۔

آج بھی ہم یہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ خدا کا یہ قانون کس طرح کام کر رہا ہے۔

ظلم کی موت ہی سے عدل پیدا ہوتا ہے

لیکن دنیا یکے بعد دیگرے ہمیشہ متضاد قوتوں نے حکومت کی ہے

(DIVIDE AND RULE)

تربیت عسکری کے لیے پہلی چیز ایک متحدہ قومیت کا پیدا ہونا ہے۔ محض انسانوں کی ایک بھیڑ سے متمدن فوج نہیں بن سکتی جب تک کہ قومیت کی روح ایک متحد جماعت پیدا نہ کرے۔ باہمی اتحاد و اتفاق کی زنجیریں سب کے سب ایک بن جائیں یہی وجہ ہے کہ جو حکومتیں اپنے جبر و استبداد کے قائم کرنے کے لیے کسی قوم کے سپاہیانہ جذبات کو فنا کرنا چاہتی ہیں۔ وہ سب سے پہلے سیاسی فریب ساس کے ذریعے اس میں پھوٹ، نفاق، بغض، کینہ اور باہمی انتقام کے جذبات خبیثہ پیدا کر کے ان کی جمعیت کو توڑ دیتی ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ ان کی قومیت فنا ہو جاتی ہے۔

لیکن اس خدع و فریب کی ضرورت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب قوم میں کچھ لوگ بیدار دماغ، متحرک اعصاب اور مضطرب دل رکھتے ہوں اور سیاست کی چھپی ہوئی چالوں کے زہر آلود اثر سے متاثر ہوتے رہتے ہوں۔ لیکن جب کوئی قوم والئ دماغ کھو کر اپنے سرچشمۂ احساس کو بالکل فنا کر دیتی ہے۔ تو پھر ان فریب کاریوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ سرباز ار تلوار سے اس کے نقش وجود کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔

دنیا کی ملکی تاریخیں اس قسم کی بہت سی مٹی ہوئی قوموں کو نمایاں کر سکتی ہیں۔ لیکن مذہبی تاریخ واقعات میں تسلسل و نظام اور ترتیب نہیں ڈھونڈھتی۔ وہ دنیا کو محض عبرت کا افسانہ سناتی ہے اس لئے وہ صرف ایک اہم اور کثیر النتائج واقعات کا انتخاب کر لیتی ہے۔ جو تمام دنیا کے لیے مجموعہ

انقلاب قوت وصنعت

یہ تو سلطنت فرعونی کے انقلاب کی سرگذشت تھی۔ لیکن غور کرو کہ اس آیت کریمہ کے اندر قرآن حکیم نے کس طرح اپنے ایک قانون الہٰی کی خبر دے دی ہے؟ وہ تبلاتا ہے کہ دنیا قوت کے جاہ وجلال کی نمائش گاہ ہے۔ اور کمزوروں کی ہلاکت کا مقتل ہے۔ طاقتور قومیں کمزوروں کو اپنا غلام ومحکوم بناتی ہیں۔ ان میں پھوٹ اور اختلاف ڈالتی ہیں۔ ان کے مختلف فرقوں اور مختلف گروہوں کو باہم ملنے نہیں دیتیں۔ کیوں کہ اگر وہ مل کر ایک ہو جائیں۔ تو پھر کمزور نہ رہیں اور اتفاق ویگانگت کی طاقت اعلیٰ ظالموں کا تخت وتاج الٹ دے۔ یہی حال مصر میں بنو اسرائیل کا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کا ایک مستثنیٰ قانون بھی ہے اور خدا کے زبردست ہاتھ کی گاہ گاہ چمک جانے والی حرکت بھی ہوتی ہے جب ظلم اور طاقت کے شیطان کا غرور حد سے بڑھ جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا طاقت والوں کی جگہ کمزوروں کا گھر بنادی جاتی ہے اور وہی زمین جو کمزوروں کے لیے مقتل گاہ تھی۔ طاقت والوں کی تباہی وہلاکت کا تماشا بن جاتی ہے۔ پس اس دن چھوٹے بڑے کئے جاتے ہیں۔ اور بڑوں کو چھوٹا بنایا جاتا ہے۔ وہ کہ کمزور کردئے گئے تھے۔ وہ کہ بے کس و بے نوا تھے وہ کہ صرف رونے، ماتم کرنے، بے بسی کی چیخیں مارنے اور لٹنے لٹانے کے لئے،

رات کے جانے کے بعد ہمیشہ دن جلوہ گر ہوا ہے۔ تاریکی کے بعد ہمیشہ روشنی چمکی ہے۔ سیاہی کے بعد ہمیشہ سفیدی نے ظہور کیا ہے۔ یہی حال حکومتوں اور سلطنتوں کا بھی ہے۔ جب ایک ظالم حکومت مٹتی ہے تو اس کی جگہ اسی وقت ایک عادل سلطنت قائم ہو جاتی ہے۔ ظلم کا جانا ہی عدل کے ظہور کا پیام ہے۔ اور رات اگر ختم ہو گئی تو اس کے یہی معنی ہیں کہ دن آگیا۔ جب جابرانہ قوموں کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تو ایک عادلانہ نظام قائم ہو جاتا ہے۔ فرعون کی جابرانہ سلطنت کا زوال ایک دوسری قوم کی عادلانہ حکومت کا مقدمہ تھا۔ اس لئے خدا نے فرعونیوں کی ہلاکت کے ساتھ ہی عدل الہی کے قیام کا بھی مژدہ سنا دیا۔

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون۔

" اور ہم اپنے دائمی قانون عدل کی بنا پر چاہتے ہیں۔ کہ جو لوگ ہماری زمین میں کمزور بنا کر ایک مدت تک رکھے گئے ہیں ان پر احسان کریں۔ اور ان کو دنیا کی پیشوائی عطا فرمائیں۔ بڑی بڑی طاقتور قوموں کے تاج و تخت کی وہی وارث ہوں۔ اور ان کی پادشاہت زمین پر قائم ہو جائے۔ فرعون ہامان اور ان کی حکمران قوم کو ان کی طرف سے جس چیز کا کھٹکا تھا، اور جس کے لئے وہ انہیں کمزور رکھتے تھے وہی ان کے سامنے لائیں گے! "

طوفان خیز موجوں کی آغوش میں انہیں ڈال دیا گیا۔ کہ ایک دن دریا کے طوفان ہی میں سے ان کو اپنی راہ نکالنی تھی۔

واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی انا رادوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین۔

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اس کو دودھ پلائے۔ اور اگر فرعون کے ظلم کی وجہ سے اس کی جان کا خوف ہو تو دریا میں ڈال دے اور کسی قسم کا خوف یا غم نہ کرے۔ ہم پھر اس کی گود میں اس کے لخت جگر کو واپس کر دیں گے۔ اور اس کو اپنا پیغمبر بنائیں گے۔

حضرت موسیٰ کی والدہ نے اپنے لخت جگر کو دریا کی لہروں کی آغوش میں ڈال دیا۔ لیکن نیل کی لہریں اس امانت مقدس کو اور کہیں نہیں لے گئیں۔ اسی کے محل تک بحفاظت پہنچا دیا۔ جس کے سر غرور کو کچلنے کے لیے ایکدن یہ شیر خوار بچہ اٹھنے والا تھا۔ پھر فرعون کی عورتوں کو ان پر مہربان کر دیا۔ انھوں نے اپنے بچوں کی طرح خاص شاہی محل کے اندر پرورش کی۔ اور ان کی والدہ ہی ان کی دایہ قرار پائیں۔ اس میں اللہ کی بڑی مصلحت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کی پرورش شاہی محل ہو گی۔ تو بادشاہوں کے جاہ و جلال باطل کا رعب ان کے دل سے نکل جائے گا۔ اور

تھے۔ وقت آتا ہے کہ احسان اہی کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ اور کمزوری کی جگہ طاقت کے لیے، بیکسی کی جگہ فرما نروائی کے لیے، رونے کی جگہ تو شیون کے لیے ماتم کی جگہ عیش و کامرانی کے لیے اور لٹنے کی جگہ لوٹنے کے لیے تمام عالم میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ قوت فرعونی کی جگہ قوت موسوی کی تلوار ان کی آن میں دنیا کو پلٹ دیتی ہے اور صدیوں کی گری ہوئی قومیں پھر جاہ و جلال ربانی کے ظہور و قیام کے لیے دنیا کی وارث اور خلیفہ بنا دی جاتی ہیں۔

تربیت عسکری

لیکن جس طرح تلوار کی آخری حرکت کسی سلطنت کی شہ رگ کو کاٹ دیتی ہے، اسی طرح اس کی پہلی جنبش نظام حکومت کو قائم بھی کر دیتی ہے۔ حکومت سیاست کا سرچشمہ ہے اور سیاست پیاس ہمیشہ تلوار ہی کے پانی سے بجھی ہے۔ خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے تاج و تخت لٹنے اور بنو اسرائیل کی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک تیغ برہنہ کی صورت میں نمایاں کرنا چاہتا تھا اس لیے دیکھو کہ کس طرح ان کو بچپن ہی سے میدان جنگ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کا خوگر بنایا اور طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈال دیا؛ ابھی انھوں نے دنیا میں پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ ماں کے آغوش محبت سے جدا ہو گئے۔ اور جس آغوش کی محبت سے زمین پر رینگنے والے کیڑے بھی محروم نہیں رہتے۔ اللہ کی مصلحانہ مشیت نے اپنے رسول اولوالعزم کو اس سے محروم کر دیا۔ دریائے نیل کی

ایک امانت دار پیغمبر بن کر آیا ہوں۔"

داخلی تبلیغ

لیکن فرعون نے جیسا کہ تمام ظالم بادشاہوں کا طریقہ ہے۔ ان کے اس الٰہی مطالبے کو رد کر دیا۔ پس ضرور ہوا۔ کہ اب کچھ دنوں تک مصر ہی میں رہ کر بنو اسرائیل کی تربیت و تعلیم کا انتظام کیا جائے اور صدیوں کی محکومی و غلامی نے جس درجہ ان کے قوائے قوی کو معطل کر دیا ہے۔ اسی درجہ کسی قوی و مؤثر تعلیم کے ذریعے ان میں حریت و استقلال کے عزائم پیدا کئے جائیں۔

پس حکم الٰہی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی دعوت کی داخلی تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ اور بنی اسرائیل کو آنے والے وقت کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس تیاری کا طریقہ اور اس کے اصول جو قرآن حکیم نے بتلائے ہیں۔ ہم کسی دوسری صحبت میں ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

پہلی فوجی نمائش

جب ایک اچھی مدت اس پر گزر گئی۔ تو حکم الٰہی ہوا کہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ اس تیار کردہ فوج کی حرکت شروع ہو جائے۔ پس پہلی منزل یہ ہے۔ کہ اب فرعونی گورنمنٹ کے ساز و سامان

بچپن ہی سے شاہانہ زندگی۔ سیاست و ملک داری کے طریقے، اور ظالمانہ حکومتوں کے تمام اسرار وخفایا ان پر منکشف ہو جائیں گے۔

فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا ان فرعون وھامان وجنودھما کانوا خاطئین۔

پھر اس کو آل فرعون نے دریا سے نکال لیا۔ اور اس بچے کو پرورش کیا۔ تاکہ آگے چل کر وہ ان کا دشمن اور سرمایہ رنج وغم بنے۔ بے شک فرعون ہامان اور ان کا لشکر غلطی پر تھا۔ جب اپنے دشمن کو اپنے گھر کے اندر پال رہا تھا۔"

اس کے بعد آزمائش و ابتلاء کے متعدد موقعے پیش آئے۔

سپہ سالار جنگ

فوج کی تنظیم و ترتیب کے لئے جس سپہ سالار کی ضرورت تھی۔ وہ تمام آلات حرب سے مسلح ہو گیا۔ لیکن وہ جن لوگوں سے اپنی فوج کو مرتب کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود گرفتار زنداں مصیبت تھے۔ اس لئے اپنا پہلا مطالبہ جو فرعونی گورنمنٹ سے کیا وہ اسی فوج کی رہنمائی کا مطالبہ تھا۔

ان ادوا الی عباد اللہ انی لکم رسول امین۔

خدا کے ان بندوں کو میرے حوالے کردو۔ میں تمہارے پاس

"اے پیغمبر مسلمانوں کو جہاد کے لئے ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی بھی صابر ہوں۔ تو وہ دو سو دشمنوں پر غالب آ جائیں گے۔ اور اگر تم میں سے سو آدمی بھی صبر کی طاقت رکھتے ہوں گے۔ تو کفار کی ایک ہزار جمعیت پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔"

عزم و استقلال اور صبر و توکل کی طاقت صرف افراد کی کثرت سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی آزادی کی زندگی ہی پیدا کرتی ہے۔ جو قوائے انسانی کی نشو و نما کی فطرتی تربیت گاہ ہے۔

لیکن آزادی ایک ایسا جوہر ہے۔ جو کبھی تو اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ ہر ریگستان کے چمکتے ہوئے ذرے میں مل سکتا ہے اور کبھی اس قدر گراں قیمت ہو جاتا ہے کہ صرف تاج شاہی کے ٹکے ہوئے موتیوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قوم کی تعلیم و تربیت کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ اس کے اندر یہ جوہر یکسر مفقود ہو گیا تھا۔ فرعون کی غلامی نے اس کے تمام شریفانہ جذبات فنا کر دیئے تھے۔ اس نے کبھی حکومت کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کی طاقت نے مومنین بالغیب کا ایک چھوٹا سا گروہ ضرور پیدا کر دیا۔ جس نے حریت صادقہ کی روح سے معمور ہو کر فرعون کو للکارا تھا۔

فاقض ما انت قاض انما تقضی هذه الحیوۃ الدنیا

اور احکام و قوانین کی بالکل پروا نہ کرو۔ وہ بنو اسرائیل کو اپنی غلامی سے نکلنے نہیں دیتی ہے۔ مگر اس کو اپنے ساتھ لے کر راتوں رات نکل کھڑے ہو۔ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ لیکن عذاب الٰہی بھی اس کے تعاقب سے غفلت نہیں کرے گا۔

فاسر بعبادی لیلا انکم متبعون

"میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ۔ کیونکہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔"

انھوں نے حکم الٰہی کی تعمیل کی۔ اور اس طرح فوج کے لئے جس انتظام و انضباط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا قوام بند۔ ہو گیا۔

روح عسکری

لیکن فوج صرف آدمیوں کی اس صف ہی کا نام نہیں ہے۔ جو میدان جنگ میں دیوار کی طرح کھڑی کر دی جاتی ہے۔ بلکہ جس طرح دنیا کی ہر حقیقت مادہ و قوت سے مرکب ہے۔ اسی طرح فوج بھی جسم و روح کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ تو پروردگار کا کام ہے۔ وہ چاہے تو ایک انسان کو ایک ہزار انسانوں پر غالب کر دے۔

یا ایھا النبی حرض المومنین علی القتال ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفا من الذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون۔

اذجعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا و آتکم مالم یوت احداً من العالمین یاقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علیٰ ادبارکم فتنقلبوا خاسرین۔

" جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ اے لوگو خدا کی نعمتوں کو دیکھو۔ اس نے تم میں پیغمبر پیدا کئے تھے۔ اب تم کو پادشاہ بنانا ہے۔ اور وہ عظمت عطا فرماتا ہے۔ جواب تک کسی کو بھی نہ دی تھی۔ پس عزم اور ہمت کرو۔ اور ارض مقدس میں داخل ہوجاؤ۔ اس کی حکومت صرف تمھاری ہی قسمت میں لکھی گئی ہے۔ اور ہرگز بزدلوں کی طرح پیٹھ نہ پھیرو۔ اس کا نتیجہ بجز ناکامیابی ومحرومی کے کچھ نہ ہوگا۔"

لیکن یہ امتحان ایک ایسی قوم کے لئے سودمند نہ ہو سکا۔ جو صدیوں سے غلامی کی لعنت میں گرفتار تھی۔ بنواسرائیل کی بزدلی نے نہایت مایوسانہ جواب دیا۔

قالو یموسیٰ ان فیھا قوماً جبارین، وانا لن ندخلھا حتیٰ یخرجوا منھا۔ فان یخرجوا منھا فانا داخلون۔

" ان لوگوں نے جواب دیا۔ کہ اے موسیٰ ارض مقدس میں ایک نہایت ہیبت ناک قوم رہتی ہے۔ ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتے۔ وہ اپنے سازوسامان اور طاقت سے ہمیں پیس ڈالیں

"جو حکم چاہے ہمارے لئے دو۔ تمہاری حکومت زیادہ سے زیادہ اس دنیوی زندگی ہی کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ ہمیں قتل کر دے اس سے زیادہ تم اور کیا کر سکتے ہو؟

لیکن یہ بھی صرف نور ایمان کی ایک جدید روح کی صدا تھی جس نے غلاموں کے ملک میں حریت حقہ کا غلغلہ بلند کر کے ایک نمونہ قائم کر دیا۔ ورنہ بنو اسرائیل کے حلقے سے کبھی اس قسم کی صدائیں بلند نہیں ہو سکتی تھیں۔

جہاد فی سبیل اللہ سے اعراض

پس اس بنا پر بنو اسرائیل کی فوجی تعلیم و تربیت کے لئے وہی قدرتی مرکز موزوں تھا۔ جہاں انسان نے سب سے پہلے آزادی کی ہوا کھائی ہے۔ یعنی آبادیوں اور بستیوں سے الگ کوئی صحرا اور میدان، جہاں نہ کسی کی حکومت ہو، نہ کسی انسان کا حکم آزاد چڑیوں کے غول ہوں اور خود مختار پرندوں کے جھنڈ، اسی کارگاہ فطرت حقیقی میں رہ کر وہ اپنی گم شدہ حریت کو تلاش کر سکتے تھے۔ جو مصر کی آبادیوں میں کھو گئی تھی!

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پہلے آنے والے جاہ و جلال و عظمت کو یاد دلا کر ان کے جذبہ شجاعت کو تازہ کرنا چاہا۔

واذ قال موسی لقومہ یا قوم اذکروا نعمت اللہ علیکم

اور انھوں نے صاف جواب دیدیا :-

قالوا یموسیٰ انا لن ندخلھا ابدا مادامو افیھا فاذھب انت وربك فقاتلوا انا ھھنا قاعدون ۔

" ان لوگوں نے کہا اے موسیٰ جب تک وہ طاقت ور لوگ اس شہر میں ہیں ۔ ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتے. تم اپنے خدا کے ساتھ جاکر لڑو۔ ہم اس جگہ بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے ۔ "

چہل سالہ قیام صحراء

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بالکل مایوسی ہوگئی اور انھوں نے اس بزدل قوم سے علیحدہ ہونا چاہا ؛

قال رب انی لا املك الا نفسی و اخی فافرق بیننا و بین القوم الفسقین ۔

حضرت موسیٰ نے کہا ۔ خداوندا! میں صرف اپنے وجود پر اور اپنے بھائی ہارون ہی پر اختیار رکھتا ہوں ۔ اپنی قوم کی بزدلی اور روحانی موت کو کیا کروں ؟ اب مجھ میں اور اس بدکار قوم میں علیحدگی کردے ۔"

لیکن حکم الٰہی ہوا کہ اے موسیٰ ! تم مایوسی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہو ۔ تمہاری پیغمبرانہ استقامت کی طاقت

گے۔ جب تک کہ وہ ملک سے خود بخود نہ مٹ جائیں ہم اس کا رُخ نہ کریں گے۔"

اس داخلے سے محض شاہی جاہ وجلال کا منظر دکھانا مقصود نہ تھا۔ بلکہ بنو اسرائیل کی قدیم کھوئی ہوئی عظمت کو خلافِ الٰہی کی عبرت میں قائم کرنا تھا۔ اور خلافت الٰہی کے قائم کرنے کے لئے جس قسم کی شجاعت درکار ہوتی ہے۔ اس کو صرف نور ایمان ہی قائم کر سکتا تھا۔ بنو اسرائیل کے دل اس کی حرارت سے خالی تھے۔ دو مخلص مومنوں نے اپنے نور ایمان کی حرارت سے ان کے دلوں کو گرمانا چاہا :-

قال رجلان من الذین یخافون انعم اللّٰہ علیہما ادخلوا علیہم الباب۔ فاذا دخلتموہ فانکم غالبون وعلی اللّٰہ فتوکلوا ان کنتم مومنین۔

جو لوگ بیت المقدس میں داخل ہونے سے ڈر رہے تھے۔ انہیں میں سے دو آدمیوں نے جن پر خدا نے نور ایمان کے ذریعے سے احسان کیا تھا۔ کہا جہاد فی سبیل اللہ سے انکار نہ کرو۔ اور اللہ پر اعتماد کر کے ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ۔ جب اس کے اندر داخل ہو جاؤ گے۔ تو تم یقیناً غالب ہو گے۔ اگر تم مسلمان ہو تو خدا پر بھروسہ کرو۔"

لیکن اس پر بھی ان کے دلوں میں حرارت پیدا نہ ہوئی

دنیا بدل گئی مگر برطانوی حکمران ابھی پرانی دنیا کی باتیں کر رہے ہیں

(لاہور میں مولانا آزاد کی تقریر)

لاہور:- ۱۴ر فروری ۱۹۴۶ء ۔ سٹی کمیٹی لاہور کے زیر اہتمام اہالیان لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا ۔ اس جلسہ میں نہ صرف لاہور بلکہ امرتسر ۔ گوجرانوالہ ۔ وزیرآباد ۔ قصور ۔ شیخوپورہ اور دیگر نواحی بستیوں کے لوگ بھی امام الہند حضرت مولانا آزاد کی تقریر سننے کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے ۔ حاضرین کی تعداد ۲ لاکھ کے قریب تھی ۔ حضرت مولانا نے بین الاقوامی حالات پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ۔ اور حکومت و کانگرس میں سمجھوتہ نہ ہونے کے مدلل اسباب بیان فرمائے ۔ حضرت مولانا نے فرمایا ۔

بہنو اور بھائیو ! پچھلے برس بھی جاڑے کا موسم تھا کہ میں نے آپ کی صورتوں کو اپنے چاروں طرف پھیلا ہوا پایا اب ۱۳ ماہ سے زیادہ مدت گزر چکی ۔ یہ ہماری معمولی زندگی

کو ان مشکلوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ بنی اسرائیل کو مدتوں کی غلامی نے جہاد فی سبیل اللہ کی مقدس راہ سے ناآشنا کر دیا ہے وہ چھوٹی چھوٹی راحتوں کے عاشق ہیں۔ بڑے مقصد کی راہ میں مصیبت اُٹھانے سے جی چراتے ہیں۔ غلامی کی زندگی کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ پس اس سے نہ گھبراؤ اور انھیں یہاں سے نکال کر کسی آزاد و بے قید صحرا میں جا بساؤ۔ وہاں کی خالص اور فطری آب و ہوا میں ایک زمانہ بسر کریں۔ عہد غلامی کی پرورش یافتہ نسل مٹ جائے۔ ایک نئی مستعد نسل پیدا ہو۔ پھر وہ راہ جہاد کی مشکلات کو برداشت کر سکے گی۔

قال فانها محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض فلا تاس علی القوم الفسقین۔

خدا نے کہا بیت المقدس کا داخلہ ان کے لئے چالیس سال تک حرام ہو گیا۔ اب اسی سرزمین میں وہ سرگرداں رہیں گے۔ حصول عظمت میں یہ چہل سالہ تاخیر انہی کی بزدلی کا نتیجہ ہے۔ پس ایسے لوگوں کی محرومی پر تمہیں افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔

ہو سکتی اور اتفاقات نے ایسی طاقتوں کو جنگ کی آغوش میں دھکیل دیا۔ جن کے ساتھ ہماری ہمدردی تھی۔ ہم نے چین اور روس کے ساتھ ہمدردی کا اعلان کیا۔ اور ویسے ہی ہمارا رجحان اسی طرف ہو سکتا ہے۔ جو جمہوریت کا حامی ہو۔ اس لئے ہم نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم ہندوستان کی حفاظت کرنے پر آمادہ ہیں لیکن ہمیں یہ تو بتایا جائے۔ کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں۔ ہمیں کہا جاتا ہے۔ کہ ہمارے گھر کو خطرہ ہے، لیکن پہلے ہمیں یہ تو معلوم ہو کہ یہ واقعی ہمارا گھر ہے۔ اور ہمیں اس میں آزادانہ طور رہنے کا حق ہے۔ اگر ہمارا گھر پہلے ہی اجڑ چکا ہے۔ اب ہمیں اس سے کیا ؂

دل میں کیا تھا کہ نہ غم اسے ویراں کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

مولانا نے کہا۔ کہ ہم نے اس سرزمین میں عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورنمنٹ نے اس کے راستہ میں روڑے اٹکائے۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی گئیں لیکن اگر ہم عزت کے ساتھ مرنے کی خواہش کرتے ہیں۔ تو ہمیں کیا جہنم میں جائے۔

میں کوئی بڑی مدت نہیں۔ ع

دو کروٹیں لیں عالمِ غفلت میں خواب کی

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے غیبی ہاتھوں نے گھڑیوں کی رفتار تیز کر دی ہے۔ ان تیرہ مہینوں میں دنیا کا نقشہ پرزے پرزے ہو گیا ہے۔ گھڑیوں کی منٹوں کی سوئیاں مہینوں کی رفتار سے چل رہی ہیں۔ اور پتہ نہیں کہ قدرت کا مخفی ہاتھ اب دنیا کا نقشہ کس صورت میں تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت تک کئی دیواریں گر چکی ہیں۔ اور جو باقی ہیں وہ گرنے والی ہیں۔ اس لئے کہہ نہیں سکتے۔ کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آنے والا ہے۔ اس عرصہ میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی اور وہ یہ کہ پہلے جہاں ہم موجودہ خونی جنگ میں ایک تماشائی کی حیثیت رکھتے تھے اب وہی خونریز جنگ ہمارے دروازوں پر ہے۔ اس لئے اپنے فرض سے غافل نہیں ہو سکتے۔

دروازے بند ہو گئے

مولانا نے کہا کہ اڑھائی سال سے یہ کھیل کھلایا جا رہا ہے۔ اس عرصہ میں ہماری پوزیشن کسی سے مخفی نہیں رہی۔ ہم نے ہر قدم پر اپنے فرض کا احساس کیا۔ ہم نے علانیہ طور پر اعلان کیا۔ کہ ہماری ہمدردی نازی قوتوں کے ساتھ نہیں

کہ موجودہ برٹش گورنمنٹ یہ تسلیم کرے گی۔ کہ ہندوستان کو۔
Self determination
کا حق ہے۔ تو وہ اس خیال کو بالکل نکال دے۔ میں صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ برٹش گورنمنٹ نے ہماری ترقی کے تمام دروازے بند کر دئے ہیں۔ اور اس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں۔ کانگرس کو اس کے متعلق پورا تجربہ ہے

اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہ کانگرس پر یہ شرمناک الزام لگایا جائے۔ کہ وہ بعض جماعتوں کی حق تلفی کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ کانگرس نے بارہا اعلان کیا ہے۔ کہ وہ کوئی آئین منظور نہیں کر سکتی۔ جو خود ہندوستانی مرتب نہ کریں۔ کانگرس ہندوستان کو خود آئین سازی کا حق دلانا چاہتی ہے۔ اور کانگرس کی بائیس سالہ زندگی اس امر کی دلالت کرتی ہے کہ کانگرس سے زیادہ اس امر کے لئے اور کوئی بھی بیتاب نہیں۔ کہ ہندوستان کو حق آزادی دے دیا جائے۔

کھلا ہوا راستہ

مولانا آزاد نے کہا۔ کہ میری صدائیں اکثر اخبارات کے اوراق کے ذریعہ آپ کے کانوں سے ٹکراتی رہتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ آپ کے دلوں میں اتر جائیں

برٹش گورنمنٹ کی روش

مولانا نے کہا۔ کہ اس وقت تک برٹش گورنمنٹ کو ہم نے کئی موقعے دئے۔ لیکن ہمیں ہر وقت ٹال دیا گیا ہے ہماری تمناؤں کو پامال کردیا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ اس وقت باوجودیکہ ندی کا پانی اس قدر جا چکا ہے کہ شاید واپس نہ آسکے۔ برٹش گورنمنٹ کے رویہ میں کوئی تبدیلی واقعہ نہیں ہوئی اور اس وقت تک برٹش گورنمنٹ پر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جن کے دل میں ہندوستان کے لئے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں یہ سب باتیں سنتے سنتے تنگ آگیا ہوں۔ دنیا بدل چکی ہے۔ مگر یہ برطانی مٹی تپلیاں پرانی دنیا کی باتیں کررہی ہیں۔ آخر اس قدر طویل بکواس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگست کی پیشکش اور بعد کی تقریریں سب بکواس ہیں۔

صرف دو سطروں میں اتنا اعلان کر دینا کافی ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو اپنے معاملات کا تصفیہ خود کرنے کا حق دے۔ اور اُسے عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس لئے اگر کوئی صاحب دل کے کسی گوشے میں یہ خیال رکھتے ہیں

وہ اپنی لہروں میں تباہیوں و بربادیوں ۔ سفاکیوں اور ہولناکیوں کا طوفان لاتی ہے ۔ اس لئے آپ کا فرض ہے کہ اس نازک موقعہ میں بھائیوں کی امداد کریں ۔ اور اس مقصد کے لئے جان بھی دینا پڑے تو مضائقہ نہیں ۔

اور آپ محسوس کریں۔ کہ انڈین نیشنل کانگرس اس وقت کی ضرورت کا احساس کرتی ہے۔ میں نے اس وقت تک جو گزارش کی وہ محض ایک تمہید تھی۔ اس پیغام کی جو میں آپ کے کانوں تک پہنچا کر آپ کے دلوں کو دستک دینے آیا ہوں۔

وہ عزت کا راستہ ہے۔ خدمت کا راستہ۔ وہ خدمت جو خدا کے لئے کی جائے۔ یہ کانگرس کا نیا تعمیری پروگرام ہے کانگرس کا پرانا تعمیری پروگرام اچھا تھا۔ کاش اس پر عمل کر عمل کرتے۔ ہم کہتے تھے کہ ملک کی مصنوعات استعمال کرو۔ آپ نے نہ سنا۔ اب سمندر کے راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ وہ جہاز جو بدیشی مال لا کر ہمارے ملک میں پھیلاتے تھے۔ ڈوب چکے۔ اس لئے اب وقت ہے کہ دیہات کی صنعتوں کو فروغ ہو۔

کانگرس کا پروگرام خدمت کا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا وہ آپ تک صوبہ کانگرس کمیٹیوں کے ذریعہ پہنچ جائے گی۔ مگر آپ کے دلوں کو جھنجھوڑ کر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ جنگ کی خون آشام لہریں ہندوستان کے ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ میری آنکھیں وہ خون کا نقشہ دیکھ رہی ہیں۔ اس لئے ہم غافل نہیں رہ سکتے۔ جنگ آپ کو جھونپڑوں کے بچھونوں پر لیٹنے کی اجازت نہیں دے سکتی

کا بھی یقین دلایا گیا ہے۔ کہ ہمالیہ کی چوٹیاں سمندر کی موجیں اور صحرائے عرب کے بگولے بھی میری آواز نہیں روک رہے ہیں۔ بمبئی کلکتہ سے تیرہ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ پشاور پندرہ سو میل دور ہے۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں۔ کہ تمہارے کانوں سے تمہاری دل کی دنیا کتنی دور ہے؟ میری آواز تمہارے کانوں کے پردے سے ٹکرا کر رہ جاتی ہے۔ اور دل کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ وہ دل جس پر تم نے قفل چڑھائے ہیں۔ حالانکہ میرے مخاطب تمہارے کان نہیں۔ بلکہ تمہارے دل ہیں

۱۹۰۶ء میں والد مرحوم کی موجودگی میں سب سے پہلے اس مقام سے اسی ممبر پر سے میری ایک ہی آواز، جو حقیقت کی آواز ہے۔ بلند ہوئی اور آج ۱۹۳۶ء میں پورے تیس برس کا عرصہ جبکہ گزر چکا ہے۔ باستثنا چند سالوں کے جب کہ وقت کے اہم اور ملک کی نازک صورتِ حال نے جراً مجھے کلکتہ سے دور و معذور رکھا تھا۔ میں اُسی حقیقت کا اعادہ کرتا رہا ہوں۔ اور تمہیں توجہ دلاتا ہوں، لیکن تم نے اب تک میری ایک بات نہ سنی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں تمہارے دل کا نام نہیں لیتا۔ تمہارے کانوں تک اپنی صدائیں پہنچاتا ہوں۔ کیونکہ تم نے اپنے دلوں پر غفلتوں کے اتنے پردے ڈال لئے ہیں اور امتیاز و عرفان کے اس مرکز پر اتنے قفل چڑھا لئے ہیں۔ کہ

خطبہ عید الضحیٰ

میدان میں عید الضحیٰ کا اجتماع الحمد للہ عید الفطر سے کہیں زیادہ تھا۔ بلکہ شاید یہ پہلا موقع ہے۔ کہ میدان عیدین میں اتنا بڑا اجتماع کبھی ہوا ہو۔ کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ کتنے آدمی تھے۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو موجیں مار رہا تھا۔ یا انسانی سروں کا جنگل تھا۔ جو حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ نماز کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے جو خطبہ ارشاد فرمایا۔ آگے ذیل میں اخبار روزنامہ ہند کلکتہ سے درج کرتے ہیں۔ یہ خطبہ۔ بذریعہ کے ذریعے ہندوستان بھر میں سنا گیا ہے۔ خطبہ مسنونہ اور انجمن تبلیغ اسلام کلکتہ کی اسلامی خدمات کی تعریف و تعارف کے بعد فرمایا۔ پہلے میری آواز اس میدان میں ایک محدود حلقہ تک پہونچتی تھی، گزشتہ چند سالوں سے پورے میدان میں، انجمن کی مساعی اور سائنس کی ایک مفید ایجاد کے امداد سے پہونچنے لگی۔ لیکن اس مرتبہ جیسا کہ مجھے یقین دلایا گیا ہے۔ میری آواز ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ رہی ہے۔ بلکہ اس مرتبہ مجھے اس بات

کے ساتھ غور وفکر نہ کیا ہو۔ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں ۔ کہ مسلمانوں کی اجتماع فلاح وصلاح بجز اس کے کسی دیگر معاملات پر موقوف نہیں ہے۔ جو قرآن کے ہر صفحہ پر لکھا ہوا تم دیکھو گے۔ اقامۃ الصلوٰۃ واتا الزکاۃ اور یہی وہ مسائل یسے مسئلے ہیں۔ جن کو تم نے سب سے زیادہ غفلت کے حوالے کر رکھا ہے۔ قرآن کریم نے اسی مسئلہ پر سب سے زیادہ زور دیا۔ سب سے زیادہ تاکید کی۔ مگر۔ آج انہی دونوں مسائل کو تم نے سب سے زیادہ پس پشت ڈال دیا ہے۔ سب سے زیادہ غفلت۔ وہ غفلت جو انکار تو نہیں لیکن قریب انکار ضرور ہے۔ اسی غفلت کی نذر کردیا ہے۔ حالانکہ کفر واسلام کے امتیاز کے سلسلہ میں بھی اسی نماز وزکوٰۃ کو معیار قرار دیا گیا۔ فرمایا فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکاۃ فاخوانکم فی الدین وہ اگر پچھلی بداعمالیوں سے تائب ہو جائیں۔ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ کی پابندی کا اقرار کریں۔ تو وہ بھی تمہاری برادری میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شرط اسلام، انحصار و مدار اسلام، نیک عملی کے ساتھ ساتھ مشروط ہے۔ قیام صلوٰۃ اور ادائے زکاۃ سے ـــــ غور کرو گے۔ تو خود سمجھو گے کہ اسلامی اعمال واحکام قطعًا اجتماعیت کے حامل ہیں ـ اسلام اپنے حلقہ بگوش افراد سے خود انہی کے مفاد کے لئے

کہ اس دل کو وہی دل جسے تم آج عید کے پرتکلف کپڑوں میں چھپائے بیٹھے ہو. مخاطب نہیں کرسکتا۔ جانتا ہوں کہ تم نے ہمیشہ میری بات ٹھکرائی ہے۔ لیکن تم میری بات سے انکار نہیں کرسکتے ۔ کیونکہ میری بات سے انکار، حقیقت سے انکار، اور تم حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے۔ تم نے میری بات سے انکار کرکے کوئی فائدہ نہ اٹھایا ۔ حقیقت سے انکار کرکے کوئی شخص فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں سراسر حقیقت ہے ۔ تم نے میری بات سے انکار کرکے اپنی اجتماعی عزت کو ضرر پہونچایا ۔ حقیقت سے انکار کرکے کوئی شخص کسی طرح کی عزت حاصل نہیں کرسکتا۔ سن رکھو کہ حقیقت میرے ساتھ ہے،

حقیقت میری آواز ہے اور وہ کسی طرح ٹھکرائی نہیں جاسکتی تم نے صبح شام ایک بات نہ سنی ۔ تم نے میرے دور جوانی کی گفتگو نہ سنی ۔ کیا اب شام زندگی کی نصیحت بھی نہ مانوگے؟ جس حقیقت کو ایک مدت سے میں تمہارے سامنے رکھتا آیا ہوں۔ آج پھر اُسی حقیقت کو تمہارے کانوں تک پہنچاتا ہوں. اور کیا اتنے بڑے انسانی ہجوم میں چند انسان بھی ایسے نہیں جن کے دلوں کی صلاحیت اس حقیقت کو قبول کرسکے ۔ میں پورے تیس برس کے غور و فکر کے بعد جس کی کوئی صبح اور شام ایسی نہیں گذری کہ میں نے پوری توجہ اور پوری دلسوزی

اور اس ممبر پر سے اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتا ہوں۔ کہ صرف یہی نہیں کہ یہ زکاۃ جو انفرادی طور پر ادا کی گئی ہے۔ درست نہیں ہے۔ بلکہ صحیح اور واضح ہے کہ وہ زکاۃ ہی نہیں ہے۔ کوئی دوسرا نام دیا جاسکتا ہے۔ زکوٰۃ کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

پس جب تک تم بحیثیت مسلمان اجتماعی طور پر قرآن کے حکم اور منشائے فطرت کے ماتحت اپنے اعمال خصوصاً نماز و زکوٰۃ کو تنظیم کے ساتھ ادا نہیں کرتے۔ تم سے وہ تمام دینی برکات اور وعدے جن کی تمکو تلاش ہے۔ ہمیشہ تم سے دور رہیں گے۔ اور جس روز تم نے اجتماعی تشکل اور اعمال میں اجتماعی حسن نظام پیدا کر لیا۔ یقین کرو کہ چھینی ہوئی تمام دولت تم کو پھر سونپ دی جائے گی۔

پس تم سے آج پھر تاکید کرتا ہوں۔ کہ اپنے اعمال میں اجتماعیت کی صورت پیدا کرو۔ اور ہر ہر قصبہ و محلہ میں کم سے کم پانچ آدمیوں کی ایک جماعت بنالو۔ چھ بھی نہیں صرف پانچ جو زکاۃ تحصیل تنظیم کرے۔ اور اسے پوری ذمہ داری اور باقاعدگی کے ساتھ صرف کرے۔ تم دیکھوگے کہ بہت جلد پورا محلہ بلکہ پورا شہر تمہاری کمیٹی کا ممبر بن جائے گا۔ اور یہ ایک قابل تقلید نمونہ بن جائے گا۔ جس کی

چاہتا ہے۔ کہ ان کا ہر عمل اجتماعی ہو۔ اس لئے فرض قرار دیا گیا۔ کہ نماز مسلمان باستثنئے حالت مجبوری ہمیشہ جماعت کے ساتھ ادا کرے۔ اگر مشاغل معاش وذرائع روزی مخل ہوں۔ تو لازم ہے کہ کم سے کم ایک وقت کی نماز ضرور ہر مسلمان جماعت کے ساتھ ادا کرے۔

زکوٰۃ

اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی حکم ہے مسلمان کی زکوٰۃ بھی اجتماعی صورت سے ادا کی جائے۔ کچھ پرواہ نہیں اگر پورے شہر کی تنظیم نہیں ہوسکتی اور میں آج اس غلط فہمی کی بھی تردید کردوں جو بعض حلقوں میں ظاہر کی جارہی ہیں کہ اس کے لئے امارت کی شرط ہے۔ امارت کی قطعاً کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ وہ ایک اولیٰ صورت ہے۔ لیکن اگر امارت حالات کے تقاضا یا ماحول کے اثر سے بعیدالامکان یا ناممکن ہے۔ تو اس چیز کا جائز یا ناجائز بہانہ پر اللہ کے ایک واضح صریح اور تاکیدی حکم میں بیت ولعل، حیل وحجت یقیناً قابل سخت مواخذہ، قابل سخت وعید ہے۔ جو لوگ فرداً فرداً زکاۃ اپنے طور ادا کرتے ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ درست نہیں ہے اور آج میں ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔

ساتھ قائم و عامل ہونے پر کھوئی ہوئی دولت کی واپسی کا مدار۔

هذا وان احسن الكلام كلام الله الملك العلام

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه

واولئك هم المفلحون ؞

مومنین کے اوصاف و مدارج!

(مولانا ابو الکلام آزاد)

التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ

السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ عَنِ الْمُنْكَرِ

وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ؕ

ترجمہ :۔ توبہ کرنے والے عبادت میں سرگرم رہنے والے سیاحت کرنے والے۔ رکوع و سجود میں جھکنے والے، برائی سے روکنے والے۔ اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدبندیوں کی حفاظت کرنے والے۔

مندرجہ بالا آیت مہمات معارف میں سے ہے۔ فرمایا سچے مومنوں کے اوصاف و مدارج یہ ہیں کہ :۔

(۱) التَّائِبُونَ ۔ یعنی وہ جو اپنی توبہ میں سچے اور پکے ہوتے ہیں۔ اور ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرتے اور غفلتوں اور

عامل ہو کر خیر و برکت کے متلاشی اپنی سعادتوں اور گمشدہ متاع دولت و حشمت ڈھونڈیں گے کیا تم میں ایسے پانچ دل بھی نہیں ہیں جو میری بات بگوش دل سن سکیں؟

یاد رکھو! محض فکری وسائل سے تم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور دولت کو حاصل نہیں کر سکتے۔ بنیادی چیز جس کو تم نے اپنی غفلتوں اور گمراہیوں کی نذر کر دیا ہے۔ یعنی عمل اور عمل اجتماعی جب تک اس پر استوار اور مضبوطی کے ساتھ قائم نہیں ہوتے۔ تم کو اس وقت تک کھویا ہوا وقار یا چھینی ہوئی دولت واپس نہیں ہو سکتی۔ فکری وسائل کو محض دماغ کے اندرونی رنگ و روغن سمجھو۔ باہر کا رنگ و روغن جب ہی پیدا ہو گا۔ جب جڑ اور بنیاد مضبوط رکھو گے۔ تم کسی درخت کو ہرا بھرا سبز و شاداب رکھنے کے لیے شاخوں اور پتوں میں پانی ڈالو گے۔ تو درخت ہرگز سر سبز نہ ہو گا۔ البتہ اگر تم جڑ میں پانی دو گے۔ اس کو ہرا بھرا رکھو گے۔ تو تمام درخت سبز، شاداب اور بار آور رہے گا لہذا اگر تم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور دولت کی واپسی کی کھوج میں ہو۔ اگر تم موجودہ پستی سے بام رفعت پر دوبارہ پہنچنا چاہتے ہو تو جڑ، بنیاد اور اصل کی شادابی کی فکر کرو۔ یعنی اپنی نمازوں پر استوار ہو جاؤ اور اجتماعی شکل میں زکوٰۃ کی تنظیم و تقسیم پر قائم و عامل ہو۔ کہ یہی دونوں اصل و بنیاد ہیں اور انہی پر مضبوطی کے

(د) السّائحُون وہ جو راہ حق میں سیر و سیاحت کرتے ہیں۔
یعنی بحکم

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض

(۳ ، ۱۳۷)

زمین میں عبرت و نظر کے لئے گردش کرتے ہیں۔ علم کی ڈھونڈ میں نکلتے ہیں۔ راہ حق میں جد و جہد کرتے ہوئے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ کا رخ کرتے ہیں۔ حج کے لئے خشکی و تری کی مسافتیں طے کرتے ہیں۔

الرکعون السّاجدون وہ جو اللہ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اور رکوع و سجود کی حالت جسم پر طاری ہوتی ہے۔ اور زبان پر بھی طاری ہوتی ہے۔

الامرون بالمعروف والناھُون عن المنکر

وہ جو نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ اور برائیوں سے روکتے ہیں یعنی صرف اپنے ہی نفس کی اصلاح پر قانع نہیں ہو جاتے بلکہ دوسروں کو بھی اصلاح کرنے اور دنیا میں حق و عدالت کے نشر و قیام کو اپنا فرض سمجھتے ہیں

الحافظون لحدُود اللہ یہ آخری وصف اور آخری مقام ہوا۔ یعنی وہ جو ان تمام حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ جو اللہ نے انسان کے لئے ٹھہرا دی ہیں۔ قرآن کی اصلاح یہ ہے

لغزشوں پر نادم رہتے ہیں۔

(ب) العَابِدُوْنَ :۔ یعنی وہ جو اللہ کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں۔ اور اُن کی ساری بندگیاں اور نیازمندیاں صرف اسی کے لئے ہوتی ہیں۔ عبادت سے مقصود عبادتِ خاص بھی ہے۔ اور عام بھی۔ خاص یہ کہ خاص وقتوں اور خاص شکلوں کی عبادت جو دینِ حق نے قرار دی ہے۔ اسے پورے اخلاص اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے۔ عام یہ کہ انسان کی فکری حالت عبادت گزارانہ ہو جائے اور پھر وہ جو کچھ بھی سُنے۔ جو کچھ بھی کہے۔ جو کچھ بھی کرے۔ سب میں ایک عابدانہ روح کام کر رہی ہو۔

(ج) الحامدون :۔ یعنی وہ جو اپنی فکر سے اور اپنے قول سے اللہ کی حمد اور ستائش کرنے والے ہیں۔ فکر سے حمد و ستائش یہ ہوتی ہے کہ بحکم

وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳ : ۹۱)

آسمان و زمین کی خلقت میں غور و فکر کرنا۔ اور ان تمام کارفرمائیوں کی معرفت حاصل کرنا جو اس کی محمودیت و جمال پر دلالت کرتی ہے۔ قول سے حمد و ستائش اس فکری حالت کا قدرتی نتیجہ ہے۔ کیونکہ جس ہستی کی محمودیت دل و دماغ میں بس جائے گی۔ ضروری ہے کہ زبان سے بھی بے اختیار اس کی حمد و ثنا کے ترانے نکلنے لگیں۔

فطرت کا دروازہ کھل جائے۔ اس لئے تیسری منزل تحمید و تسبیح کی منزل ہوئی۔ یعنی اللہ کی حمد وثنا کے جوش سے معمور ہو جانے کی منزل کہ ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا پھر اگر توبہ وانابت کا ثمرہ عبادت کا ذوق، اور تحمید و تسبیح کا عرفان کامل درجہ کا ہے۔ تو ممکن نہیں کہ مومن صادق کو گھر میں چین سے بیٹھنے دے۔ ضروری ہے وطن و مکان کی الفت کی زنجیریں ٹوٹیں اور سیر و سیاحت میں قدم سرگرم ہو جائیں۔ پس یہ چوتھی منزل ہوئی اور السائحون کا طبقہ چوتھا طبقہ ہوا۔

ان چار منزلوں سے جو کا روانِ عمل گزر گیا۔ اس نے اصلاح نفس کی مسافت طے کرلی۔ پس اب پانچویں منزل الراکعون الساجدون کی ہوئی۔ یعنی بندگی و نیاز مندی میں پورے ہوگئے اور اللہ کے آگے سر نیاز ہمیشہ کے لئے جھک گیا۔ اب الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر کا مقام انہیں حاصل ہو جائے گا۔ یعنی اپنی تعلیم و تربیت کا معاملہ پورا کر کے دوسروں کے لئے معلم و مربی ہو جائیں گے چنانچہ چھٹی منزل یہی ہوئی۔ اور اسی سے آخری منزل کے ڈانڈے مل گئے۔ کہ الحافظون لحدود اللہ کا مقام ہے۔ یہاں پہنچ کر ان کے تمام اعمال حدود الہی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ خود اپنے اعمال میں بھی حدود اللہ کی کامل نگہداشت کرتے ہیں۔ اور اپنے وجود سے باہر بھی ان کے نفاذ و قیام کی نگہبانی کرتے ہیں۔

کہ تمام واجبات و حقوق کو خواہ افراد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں۔ خواہ جماعت سے وہ حدود اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ حدیں ہیں۔ جو مقرر کردی گئی ہیں۔ ان کے توڑنے میں انسانی امن و سعادت کی بنیادوں کا ٹوٹ جانا ہے۔

یہ کل سات وصف ہوئے اور جس ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں وہ قابل غور ہے۔ یہ گویا نفس انسانی کے تزکیہ و ترقی کے لئے سات درجے ہیں۔ یا سات طبقے ہیں جو یکے بعد دیگرے ٹھیک اسی ترتیب سے سلوک ایمانی میں پیش آتے ہیں۔

جب کوئی انسان راستی و ہدایت کی راہ میں قدم اٹھائے گا۔ تو قدرتی طور پر پہلا مقام توبہ و انابت کا ہی ہوگا یعنی غفلتوں اور گمراہیوں سے خواہ وہ کفر کی ہوں۔ خواہ انفاق کی۔ خواہ معاصی و ضلالت کی باز آئے گا۔ اور آئندہ کے لئے اُن سے بچنے کے لئے عہد کرے گا۔ اور اپنے سارے دل اور ساری روح سے اللہ کی طرف رجوع ہوجائے گا۔ اور یہی توبہ کی حقیقت ہے۔ پھر اگر توبہ سچی ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کی بندگی و نیاز مندی کی سرگرمی پیدا ہوجائے۔ پس یہ دوسری منزل ہوئی یا سلوک ایمانی کا دوسرا طبقہ پھر چونکہ عبادت گذاری کی زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر اور ذکر کا مقام حاصل ہو جائے۔ اور ملک السموٰت والارض کے مشاہدہ

صحابہ کرام کی بیویاں بلکہ پیغمبرؐ اسلام کی ازواج مطہرات بھی جنگ میں نکلتی تھیں اور مجاہدین کی خدمت کرتی تھیں ۔ بعد کو اس بارہ میں جو حال رہا وہ شرح بیان سے مستغنی ہے ۔

بعضوں کو اس پر تعجب ہوا ۔ کہ سیر و سیاحت کا شمار بھی خصائص ایمانی میں ہو ۔ اس لئے السَّائحُون اور السَّائحات کے لغوی اور مصطلحہ معنی سے گریز کرنے لگے ۔ لیکن فی الحقیقت ان کا تعجب محل تعجب ہے ۔ قرآن حکیم نے ہجرت کو ایمان کا بہترین عمل قرار دیا ہے جو گھربار چھوڑ کر نکلنا ہے ۔ اور جہاد فی سبیل اللہ کے فرمایا ۔

انفروا خفافا وثقالا (۹ : ۴۱) اور حج ہر مستطیع مسلمان پر مرد ہو یا عورت فرض کر دیا ۔ جو باشندگان مکہ کے کے علاوہ سب کے لئے بڑی سیاحت ہی ہے ۔

یاتین من کل فج عمیق (۲۲ : ۲۷) (۲۲ ، ۲۷) نیز جابجا زور دیا کہ ملکوں کی سیر کرو ۔ اور پچھلی قوموں کے آثار و باقیات سے عبرت کرو ۔ اُن کے عروج و زوال کے حالات و بواعث کا کھوج لگاؤ ۔ خدا کی قدرت و حکمت کی ان نشانیوں پر غور کرو ۔ جو زمین کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور اسی صورت میں یہ حکم بڑھ گئے ۔ کہ طلب علم کے لئے گھروں سے نکلو ۔ اور علم کے مرکز میں پہنچو ۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی۔ کہ نیک مقصد سے بسلسلہ سیاحت
کرنا سچے مومنوں کا بہترین عمل ہے اور ان اعمال میں سے ہے جن کے
ذریعے سے وہ ایمان کے مدارج طے کرتے اور خصائص ایمانی میں کامل
ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس سُرعت کے ساتھ صدر اول کے
مسلمان تمام دنیا میں پھیل گئے۔ اس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں
ملتی۔ اور جب تک اسلام کی عملی روح زندہ رہی ان سے
بڑھ کر زمین مسافتیں طے کرنے والی کوئی قوم نہ تھی۔ وہ سیاحت
کو سیاحت سمجھ کر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اللہ کی عبادت سمجھتے تھے
اور فی الحقیقت سیاحت نہ صرف ایک تنہا عبادت ہے۔ بلکہ
کتنی ہی عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ گھر بار چھوڑنا، عزیز و اقارب کی
جدائی برداشت کرنا۔ سفر کی مشقتوں میں پڑنا۔ قدم قدم مال خرچ
کرنا۔ آب و ہوا کی ناموافقت۔ اجنبیوں سے محبت و معاملت
اور پھر ان تمام موانع و مشکلات میں عزم و عمل کا استوار رہنا
ایثار و تحمل سے کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر
یہ عمل انجام پاتا ہے۔

سورۂ تحریم میں یہی وصف عورتوں کے لئے بھی فرمایا۔

مومنات قانتات تائبات عابدات سائحات (۶۶:۵)

اللہ کی فرمانبردار۔ برائیوں سے پرہیز کرنے والیاں۔ عبادت گذار
سیاحت میں سرگرم اور روایات سے ثابت ہے کہ نہ صرف

ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم (۹ : ۱۲۲)، اور تجارت کے سفر کو بھی فضل الٰہی کی جستجو سے تعبیر کیا۔ حتیٰ کہ حج کے موقع پر بھی اس کی اجازت دے دی۔ لیس علیکم جناح ان لا تبتغوا فضلاً من ربکم (۱۲۱۵۵) جب کہ سیر و سیاحت کے یہ صریح احکام موجود ہیں۔ تو پھر کونسی وجہ ہے کہ یہاں اس وصف کی موجودگی میں تعجب ہو!

ختم شد